سے

سکندر عرفان

چیختی خاموشی

(افسانوی مجموعہ)

سکندر

سکندر عرفان
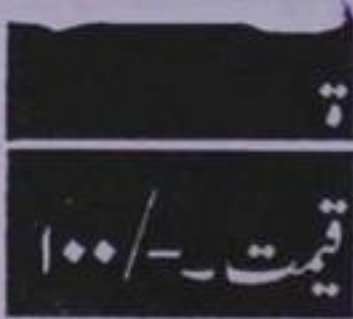
یہ کتاب ایم ۔ پی ۔ اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے ۔

نام مصنف۔	سکندر عرفان حمید
مصنف کا پتہ۔	۱۰۔ رامیشور نگر، کھنڈوہ (ایم. پی.)
فون نمبر۔	9827581717
سن اشاعت۔	۲۰۰۸ء پہلی بار
کمپوزنگ۔	عبد العلیم خان افغانی
قیمت۔	۱۰۰/-
مطبع۔	آہ پرنٹرس، چوراہا بینڈ ماسٹر، بھوپال
تعداد۔	۵۰۰

مصنف کی دیگر تصانیف:

۱۔ زخمی آواز (شعری مجموعہ)
۲۔ آنگن پھولوں کا (برائے اطفال کہانیاں)
۳۔ بکھرے موتی (برائے اطفال نظمیں)
۴۔ سمٹتے دائرے (شعری مجموعہ)
۵۔ نئے زاویے (انشائیے) زیر ترتیب

ملنے کا پتہ:۔

۱۔ صوفی بک ڈپو، املی پورہ، کھنڈوہ۔
۲۔ حیدریہ منزل، ۱۰ رامیشور نگر، کھنڈوہ۔

فہرست

☆☆☆

اپنی بات

سکندر عرفان ہمارے مدھیہ پردیش کے ہیں۔ کھنڈوہ شہر بھوپال سے چند سو کلومیٹر فاصلے پر واقع ہے۔ اس لحاظ سے سکندر عرفان ہمارے پڑوسی ہوئے اور حق بہ حق دار رسید کے مصداق سکندر عرفان کا حق واجب قرار پاتا ہے کہ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا جائے، ان کی تخلیقی کاوشوں کو سراہا جائے اور ان کے قلم سے نکلی تحریرے محظوظ بھی ہوا جائے لیکن اس طرح کے فن کو فن کی کسوٹی پر رکھ کر پہلے اس کے تخلیقی وزن کو پرکھا جائے اور پھر حقِ ہمسائگی ادا کیا جائے۔

سکندر عرفان پہلے شاعر ہیں اور پھر نثر نگار۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی خاطر خواہ پذیرائی ادبی حلقوں میں ہوئی تھی۔ ان شعری مجموعوں کی اشاعت سے سکندر عرفان کا مقام طے پا چکا تھا۔ وہ مقام ان کی سخنورانہ کاوش کے فن کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوا اور سکندر عرفان نہ صرف مدھیہ پردیش بلکہ ملک کے وہ شاعر تسلیم کیے گئے جن کی تخلیقی زمین پر ان کی اپنی فکری بصیرت قدم جمائے رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے۔

سکندر عرفان نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں اور ''بکھرے موتی'' کے عنوان سے 1999ء میں ان نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہو گیا۔ اپنی اس کوشش کو کامیابی سے ہمکنار ہوتا دیکھ کر ہی ان کا ذہن نثر کی جانب راغب ہوا اور انھوں نے بچوں کے لیے ننھی

منی کہانیاں لکھ ڈالیں۔ ان ننھی منی، معصوم اور ٹک ٹک دیدم کہانیوں کا مجموعہ ''آنگن پھولوں کا'' عنوان لیے 1999ء میں ہی شائع ہوا تھا۔ دو شعری مجموعوں اور ایک کہانی کے مجموعے کا یہ قلم کار ملک کے معتبر رسائل میں بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ سکندر عرفان کی تخلیقی صلاحیتوں کا معترف بھی ہے۔

سکندر عرفان کی شاعری فکر و احساس کی تجرباتی نقش گر بھی ہے اور مطلع ادب پہ نمودار ہوتی صبحِ صادق کی نوید بھی ہے۔ یہی وصف ان کی نثر میں بھی موجود ہے۔

ان کے افسانوں کا مسودہ میرے سامنے ہے۔ اس مجموعہ کا نام ''چیختی خاموشی'' رکھا گیا ہے۔ جس میں ۲۲/ افسانے ہیں۔ یہ سارے افسانے مختصر کہانیوں کے مروجہ فارم میں لکھے گئے ہیں۔ یہ کہانیاں مختصر بھی ہیں اور بعض مختصر ترین بھی لیکن اپنے آپ میں مکمل۔ سکندر عرفان یقیناً اس دنیا کے باسی ہیں جس دنیا میں عام انسان اپنے تمام ترجسمانی، روحانی اور وجودی مسائل کے ساتھ رہتا ہے یہ وہ دنیا ہے جہاں لمحہ لمحہ زندگی کروٹیں بدلتی ہے اور اسکی ہر بدلتی کروٹ کسی نہ کسی واقعہ کو جنم دیتی ہے۔ یہ واقعہ گو کہ بے شکل ہوتا ہے، عام نگاہ کو یہ وسعت ہی حاصل نہیں کہ وہ اس واقعہ کے مخرج کو جان سکے۔ یہ تو اس آنکھ کے انتخاب کا کمال ہے کہ وہ اس معمولی واقعہ کو اپنے بصارتی تیشے کالمس دیدے اور بظاہر اس معمولی واقعہ کو پیکر میں ڈھال کر غیر معمولی واقعہ ثابت کردے۔ یہ کمال بلاشبہ ایک دیدہ ور قلمکار اور احساس کے جذبے سے معمور کوئی فنکار ہی کرسکتا ہے۔ سکندر عرفان کے ان مختصر افسانوں میں ان کے تیشہ نما قلم کا وصف موجود ہے جس نے کسی خارجی کیفیت کو جملوں کی تصدیق کے پیکر میں ڈھال دیا ہے اور وہ کہانی اپنے وژن کی وجہ سے قاری کے مابین

رشتہ قایم کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ سکندر عرفان نے کسی تمہید کے بغیر کہانی کو جرأت مندانہ اظہار دیا ہے۔ سماجی مسائل، چھوٹے چھوٹے انسانی کرب، محبت کی گونج سے مربوط سرگوشیاں ناکامی کی چوٹ سہتی دلِ خانہ خراب کی چبھن، وجود کے آس پاس حصار قایم کرتی جذباتی کیفیت، کبھی حقیقت سے قریب کبھی حقیقت سے گریز، سکندر عرفان کے ان افسانوں میں یہ امتزاج موجود ہے۔ آپ کوئی بھی افسانہ پڑھیں تو اس کی خاموش دستک آپ کو آپ کے لاشعور میں یقیناً سنائی دے گی۔

سکندر عرفان کا افسانوی مجموعہ ''چیختی خاموشی'' دراصل ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا بیانیہ ہے جو اکثر ہم پڑھتے رہتے ہیں۔ سنتے رہتے ہیں۔ کبھی اخبار کی کسی سرخی میں، کبھی کسی کے بیان میں اور کبھی زبان سے ادا ہوتی کسی حکایت میں۔ سکندر عرفان کے افسانوں کی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں کہانی کے وژن کو ٹوٹنے نہیں دیا اور نہ کہانی کو بوجھل بنایا ہے۔ بہت آسان پیرایہ میں بیان کر دینا ان کی خوبی ہے لیکن اس طرح کہ کہانی کا اختتام پڑھنے والے کو ہلکا سا ہی سہی، چونکا ضرور دیتا ہے۔

''چیختی خاموشی'' اشاعت کے مراحل سے گزر کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گی۔ اس میں شامل افسانے پڑھ کر ہی آپ فیصلے کر پائیں گے کہ آپ کس حد تک مجھ سے متفق ہیں۔

نعیم کوثر

2/4/08

اپنی نوعیت کا واحد اردو اخبار

پندرہ روزہ **"صدائے اردو"** بھوپال

نئی نسل کے ابھرتے فنکاروں کے لیے وقف

سالانہ چندہ۔ -/200

صرف خریداروں کی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں اور
متاخرین کے یادگار فن پارے پیش کیے جاتے ہیں۔

پتہ:

صدائے اردو ۳۱ر شملہ ہلس بھوپال

انتساب

میں اپنی اس افسانوی تصنیف کو اپنے مرحوم والد بزرگوار حضرت غلام حیدر ایلچپوری کے نام معنون کرتا ہوں۔ جنکے سایہء عاطفت میں میرے ادبی شعور کو جلا ملی۔ جنکی شفقتوں اور عنایتوں نے میری فکرِ رسا کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا۔ جنکی یادیں تیرہ جادۂ حیات پر میرے لئے قندیل شب کی مترادف ہیں۔

سکندر عرفانؔ

۱۰، رامیشور نگر، کھنڈوہ (ایم۔ پی۔)

روئے سخن

''چیختی خاموشی'' میری اولین افسانوی تخلیق ہے۔ جو میرے جسم کے دیار میں بچپن سے لیکر آج تک رہ رہ کر ابھر رہی ہے۔ اس سے آپ قارئین کو روشناس کروانے کے بعد شاید مجھے یک گونہ سکون حاصل ہو سکے۔

اپنی اس تخلیق سے پیشتر ''زخمی آواز'' شعری مجموعہ ۱۹۹۳ء ''آنگن پھولوں کا'' کہانیاں برائے اطفال ۱۹۹۹ء اور ''بکھرے موتی'' بچوں کی نغمیں ۱۹۹۹ء منظر عام پر آکر قبول خاص و عام کی سند پا چکے ہیں۔

دنیا میں روزانہ رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو لفظوں کا پیرہن پہنا کر صفحہ قرطاس پر بکھیرنا میرا دیرینہ مشغلہ رہا

ہے۔ زیر نظر کتاب اسی خواب کی تعبیر ہے۔ جسکی بیشتر کہانیاں مطبوعہ ہیں۔ طویل افسانوں کی بہ نسبت منی کہانیاں لکھنا مجھے زیادہ مرغوب ہے۔ منی کہانیوں میں مجھے اپنی بات کے اظہار میں زیادہ سہولت نظر آئی۔ اسلئے میں نے اسے نسبتاً زیادہ آلہء کار بنایا۔

''چیختی خاموشی'' اس امید کے ساتھ آپکی نذر ہے کہ آپ کی آراء میرے لئے باعث تحریک ہوتی ہیں۔ آپ پسند کریں یا ناپسند کریں اپنی قیمتی رائے سے ضرور نوازیں۔ تاکہ مجھے اپنی راہ کے تعین میں آسانی ہو۔

میں منزل سے دور راہ میں بھٹکا ہوا ایک مسافر ہوں۔ ممکن ہے آپ کے چند الفاظ میری رہنمائی کرسکیں۔

اس کتاب کی صورت گری میں، میں اپنے احباب اور کرمفرماؤں کے ہر ممکن تعاون کے لئے ہر دم ممنون و مشکور ہوں۔ خصوصاً جناب نعیم کوثر صاحب اور دیگر اراکین ادارہ ''صدائے اردو'' کا جنہوں نے میری علالت کے دوران یہ ذمہ داری لی۔

سکندر عرفان

۱۰، حیدریہ منزل، رامیشور نگر، کھنڈوہ (ایم۔ پی۔)

مورخہ: ۲ر فروری ۲۰۰۸ء

پیش لفظ

اردو ہندوستان کی زبانوں میں اپنے لب ولہجہ کی تونگری اور شیرینی کے باعث ہر دل عزیز اور مقبول عام ہے اس زبان کی اپنی ایک تہذیب اور اپنی ایک عظیم الشان روایت ہے۔

ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح مرکزی اور ریاستی حکومتیں اردو کی ترقی وترویج کے لئے بھی کوشاں ہیں اور اپنے اپنے دائرہ کار اور وسائل کے مطابق عمل کر رہی ہیں۔ اس زبان کی ہمہ گیر ترقی کے لئے اردو اکادمیاں قائم کی گئی ہیں۔ مدھیہ پردیش بھی ان ریاستوں میں شامل ہے جہاں باقاعدہ اردو اکادیمی برسر عمل ہے۔

اردو زبان وادب کی ہمہ جہتی وترقی کے علاوہ مدھیہ پردیش اردو اکادیمی کے مقاصد میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس صوبے کے ادیبوں، شاعروں ناقدوں اور دیگر مصنفوں کی دو طرح معاونت کرتی ہے اوّل یہ کہ وہ ادیب جو اپنی تصانیف کی خود اشاعت کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں اکادیمی معقول مالی تعاون دیتی ہے، دوسرے یہ کہ اکادیمی کتابوں کی اشاعت کا خود بھی منصوبہ رکھتی ہے ان دونوں امور کا فیصلہ ماہرین پر مشتمل کمیٹی کی رائے کے مطابق کیا جاتا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ماہرین کی کمیٹی نے زیر نظر کتاب کی اشاعت کے لئے مالی تعاون فراہم کرنا منظور کیا ہے ہمیں امید ہے کہ شاعر/ادیب کی اس کاوش کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

نصرت مہدی
سکریٹری
مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال

لہولہان حسرت

وہ اس بے ڈول سنگِ خارہ کو بے تحاشہ چوم رہی تھی۔ اسے اس سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ اپنی نرم و نازک مخروطی انگلیوں سے اسے اس طرح چھو رہی تھی گویا وہ کپاس کا نرم و نازک گالا ہو۔ یا کوئی پھول ہو۔ جس کے لمس سے جذبات میں ایک سروری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی دیوانہ وار کیفیت سے پوری طرح غافل تھی۔ وہ تو اس پتھر کے وجد میں سما کر کھو جانا چاہتی تھی۔ اس وقت اسے دنیا کا قطعی خیال نہ تھا۔ وہ خود کو بھی فراموش کر چکی تھی۔ اپنے ماضی و مستقبل سے بے خبر حال کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی۔

وہ تھی بھی بڑی البیلی حسینہ، الہڑ، چاند جیسی آب و تاب کلوپیٹرا ایسا حسن، اس میں کنول کی سی تازگی تھی۔ چڑھتی جوانی میں دریا کی روانی کا سا جوش تھا۔ وہ چلتی تو ایسا لگتا جیسے کسی گہری ندی کا خاموش دھارا ندی سے الگ ہو کر ساز کی لے کی طرح بہہ رہا ہے۔ جب اس کے رخ روشن پر سیاہ لمبی لٹ شوخیاں اور اٹھکھیلیاں کرتی اس وقت ایسا لگتا جیسے مہندی کی جھاڑی میں کوئی ناگن محوِ رقص ہے۔

وہ اس سنگِ خارہ کو اپنی مخروطی انگلیوں سے تراشنے لگی۔ وہ اسے اپنے جذبات کی رنگینیاں دینا چاہتی تھی۔ اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتی تھی۔ وہ اس میں کھو جانا چاہتی تھی۔

محبت کے جذبے سے سرشار وہ اس بے ڈول پتھر کو ایک شکل

دینے میں اس قدر محوتھی کہ اسے وقت کا بھی خیال نہ رہا۔ بس ایک دھن تھی اسے تراشنے کی، اسے جذبات کی گہرائیوں تک لے جانے کی وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ اسکی انگلیاں چلتی رہیں۔ چلتی رہیں۔ مسلسل گردش سے اس کی خوبصورت انگلیاں زخمی ہو چکی تھیں۔ ناخنوں میں خون جم کر سوکھ چکا تھا۔ اور کنول جیسا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ اس کا شفق سا سرخ لباس جس پر لالہ کے پھول کھلے تھے ایک دم بوسیدہ ہوگیا۔ گزرتا وقت ہر ہر قدم پر اپنی پرچھائیاں چھوڑ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں جنہیں چشم غزالہ سے تعبیر کیا جاتا تھا، بجھے بجھے چراغوں کی طرح نظر آنے لگی تھیں۔ اس کی دراز سیاہ زلفوں میں سفیدی نمایاں ہونے لگی تھی۔

مگر اس کے باوجود اب بھی اسکا حوصلہ، اسکا عزم جوان تھا۔ وہ اس بے ڈول پتھر کو جذبات کا حسین رنگ دیدینا چاہتی تھی۔ ایک ایسی شکل دینا چاہتی تھی جو صرف اور صرف اسے ہی پسند ہو۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اس سے بات کرے، اس کے جذبوں کا احترام کرے۔ اپنے سینہ سے لگا کر، جی بھر کر اسے پیار کرے اور اس طرح دل کی دنیا رنگین ہو جائے۔ وہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دینا چاہتی تھی۔ جب وہ ایک خوبصورت شکل میں ڈھل کر اس کے سامنے ہوگا وہ اسے جی بھر کر پیار کریگی۔ اپنے دامن میں محبت کی سوغات لیکر جب وہ اس کے سامنے ہوگا تب وہ گزرتے وقت کو اپنی مٹھی میں بھر کر سارے موسموں کی رنگینیاں سمیٹ لے گی۔۔ اس خیال کے آتے ہی اسکی زخمی انگلیوں کی جنبش اور تیز ہو جاتی۔

مسلسل تراشنے کے باعث اس بے ڈول پتھر کے خدوخال اب

ابھرنے لگے تھے۔ اس کی شباہت میں روز افزوں تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ وہ ایک خوش شکل انسان کی صورت ابھرنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اب بولنے لگے گا۔ ایک دن وہ بھی آیا جب وہ پتھر ایک جیتے جاگتے نوجوان میں بدل گیا۔ وہ مارے خوشی کے پاگل ہوگئی۔ وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ اس کے سپنوں کی تعبیر تھا۔ وہ عالم بے خودی میں اسے چومنے لگی۔ نہارنے لگی۔

پتھر کا نوجوان ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے الگ ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں حقارت تھی۔ اور ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ وہ کرخت لہجہ میں گویا ہوا۔ اے بڑھیا! میں تیرے خوابوں کا شہزادہ کیسا؟ تیرا یہ اجاڑ جسم جسے وقت برباد کر کے رخصت ہوگیا، تیرا یہ گندہ لباس جس سے پسینہ کی بُو آرہی ہے۔ میں کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ میرے سپنوں کی شہزادی ایسی کبھی نہیں ہوسکتی۔

اتنا کہہ کر اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا۔ اور بے ہنگم قہقہے لگاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

لہولہو حسرت لئے وہ پتھرائی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسکا وجود برف کے ڈھیر کی طرح ٹوٹنے لگا۔ سناٹے کے دامن میں پھیلے وقت کی کوکھ سے اب بھی رہ رہ کر سسکیاں ابھرنے لگیں۔ دردبھری سسکیاں، آنسوؤں میں بھیگی ہوئی سسکیاں!! حسرتِ ناکام کی سسکیاں۔

☆☆☆

نقشِ پا

وہ بڑے انہماک سے میرے جوتوں پر پالش کر رہا تھا۔ گاڑی آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پلیٹ فارم پر مسافر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک عجیب سا بے ہنگم شور میرے اطراف برپا تھا۔ مگر میری سماعت کہیں کھوگئی تھی۔ نجانے کیوں میں اس معصوم بچہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اسکا کمسن سراپا، الجھے الجھے بال اور مناسب خدوخال میں جانے کیا کشش تھی۔ اسے اپنے کام سے کس قدر دلچسپی تھی، اس کی معصوم انگلیاں اب بھی سرعت سے جوتوں پر مالش کر رہی تھیں۔

ابھی ابھی اس نے میرے کسی سوال کے جواب میں اپنی چھوٹی سی زندگی کی طویل داستانِ غم سنا ڈالی تھی۔ اس شہر سے دور ایک گاؤں بناپورہ کا رہنے والا تھا۔ اسکا سوائے ماں کے اس دنیا میں کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں باپ کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ مجبوریوں کی ٹھوکروں نے اسے اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ نجانے وہ اور کیا کیا کہتا رہا۔ میں کچھ نہ سُن سکا۔ سماعت کے ساتھ ساتھ میری بینائی بھی کہیں کھوگئی تھی۔ میرے ذہن میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ خیالوں کی موجوں نے کتنی ہی یادوں کو تصور کے کناروں پر لا کھڑا کیا تھا۔ بناپورہ سے میرا روحانی رشتہ تھا۔ بناپورہ کا نام سن کر میرے اعصاب پر بجلی گر پڑی تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ اپنا وجود مجھے کسی ٹوٹے ہوئے کھلونے کی مانند لگ رہا تھا۔

بارہ سال پہلے کا گزرا ہوا زمانہ سمٹ سمٹ کر میرے تصور میں رقص کرنے لگا تھا۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن کے پردے پر رینگنے لگا تھا۔ ان دنوں میں بناپورہ چیف ایگزیکٹو آفیسر بن کر آیا تھا۔ بناپورہ یوں تو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ مگر قدرت نے اسے اپنی تمام تر رعنائیوں سے آراستہ کیا تھا۔ خوبصورت پہاڑیوں کے درمیان یہ قصبہ اس وقت اور بھی حسین ہو گیا تھا جب میری ملاقات روبینہ سے ہوئی تھی۔ روبی کا تصور بھی عجیب شئے ہے۔ اسکی والہانہ محبت کا ایک اک لمحہ میری ساری زندگی کا سرمایہ ہے۔ مگر میں خود سے ہی شرمندہ ہوں۔ میں نے محبت کے پاک دامن پر بے وفائی کا بدنما داغ لگایا ہے۔ محبت کے نازک شیشہ کو بے اعتنائی کے پتھر سے پاش پاش کر دیا ہے میں نے۔ شاید یہی احساس مجھے کہاں کہاں لئے بھٹک رہا ہے۔ میں خود سے فرار پانا چاہتا ہوں۔

روبی کی محبت نے بناپورہ کی فضاؤں کو مزید سحرانگیز اور رومان پرور بنا دیا تھا۔ اس وقت ہمیں اس بات کا قطعی احساس نہ تھا کہ ہم جس مقام پر ہیں وہاں سماج کی بے رحم زنجیریں رسموں کی شکل میں ہمارے اطراف کھڑی ہیں۔ زنگ آلود رسمیں، جذبات کی قاتل رسمیں جن کے دامن خون سے رنگے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لئے درد کی سوغات لیکر آئی ہیں ہمیں معلوم نہ تھا۔

اپنے نابینا باپ کی خدمت روبی کا معمول تھا۔ اور محبت میری محبت روبی کی زندگی تھی۔ یہی سب کچھ روبی کی کائنات تھی۔ میری دنیا بڑی عجیب تھی۔ میرے والدین اور رشتہ دار اعلیٰ سوسائٹی کے دلدادہ اور پروردہ تھے۔ بھرا پرا خاندان جس کے ہر فرد کی فطرت صرف اونچے

خواب دیکھنا اور آسمانوں میں پرواز کرنا تھی۔ مگر میں نے ان سب سے الگ، بناپورہ آکر اپنے خواب روبی کی پلکوں پر سجادئے تھے۔ نجانے کیسی کیسی تمنائیں ہمارے دلوں میں گھر کرگئی تھیں کتنے ہی عہد و پیمان جوانی کے خمار اور جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے روبی سے کر لئے تھے۔ ہم نے سماج کی رسموں سے بغاوت کر کے ایک دوسرے کو رشتۂ ازدواج کے مضبوط بندھن میں باندھ لیا تھا۔ اور روبی نے بڑی معصومیت سے مجھ پر بھروسہ کر کے خود کو میرے حوالے کر دیا تھا۔

زندگی کی راہوں پر چلتے ہوئے میں یہ بھلا بیٹھا کہ میرے والدین اور ان کی اعلیٰ سوسائٹی اس رشتے کو ہرگز قبول نہیں کرینگی۔ آنے والے طوفان سے بےخبر وقت کا دھارا بہتا رہا۔ کتنے ہی بے رنگ سپنے رنگین ہوکر مسکرانے لگے۔ تمناؤں کی کشتیاں زندگی کے سمندر میں محوِ سفر تھیں۔ منزل سے بے نیاز ایک مبارک لمحہ ایسا بھی آیا جب روبی نے مجھے یہ خوش خبری دی کہ ہمارے گلشن میں ایک نیا پھول کھلنے والا ہے۔

اسکے بعد وہ طوفانی دور شروع ہوا جس نے ہمارے خوابوں کے محل مسمار کر دیئے۔ مجھے ایک ساتھ دو ٹیلی گرام ملے۔ ایک میرے تبادلہ کا دوسرا والدہ کی علالت کا۔ روبی کو ساتھ لیجانا ممکن نہ تھا۔ والدین کے سامنے اسے لے جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں ایسے حالات میں خود کو کس قدر کمزور پا رہا تھا۔ اس الجھن میں کتنی ہی راتیں روبی نے میرے سینے سے لگے رو رو کر گزاری تھیں۔

روبی کو وعدوں کے نحیف سہارے پر روتا ہوا چھوڑ کر میں والدہ کے پاس چلا آیا۔ والدہ کی علالت کی خبر غلط تھی۔ وہاں تو میری شادی کی

تیاریاں چل رہی تھیں ۔ گھر کا ماحول بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ میں کانپ گیا سب کچھ دیکھ کر ۔ میری حالت قصاب کے چھری تلے تڑپتے جانور کی طرح ہوگئی ۔ میں چاہ کر بھی رو نہیں سکا۔ کتنا کمزور کس قدر لاغر اور مجبور ہو گیا تھا میں ۔ میری زبان پر تالے پڑ گئے تھے اور میری آواز گھٹ کر رہ گئی تھی ۔ سماج کی اونچی فصیلوں کے بیچ گھر کر میں زندہ لاش بن گیا۔ میرے آنسو خشک ہو گئے مگر میرا وجود خاکستر ہو چکا تھا۔ میں ہار گیا اور آخر کار مجھے رسموں کی صلیب پر چڑھا دیا گیا۔

بارہ سال کے اس عرصہ میں کئی انقلابات آئے ۔ میری نئی بیوی ایک حادثہ کا شکار ہو گئی ۔ میں شرمندگی کا بوجھ لیکر نجانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ روبی کی محبت اسی احساس کے بوجھ تلے دفن ہوگئی ۔ زندگی مجھے راہی بے منزل کی طرح لئے پھرتی رہی حالات کی موجوں میں بہتا ہوا میں آج یہاں تک آ پہنچا۔

وہ پالش کر چکا تھا۔ سوچ کے نشیب وفراز میں گم مجھے دیکھ کر وہ بھی حیران تھا۔ اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ روبی اس کی ماں ہے مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ میری محبت کی نشانی ہے ۔ میرے ماضی کی رہ گزر میں بکھرا میرا نقش پا ہے ۔ میرا اپنا خون ہے ۔ روبی کے خوابوں کا عکس ہے ۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ روبی اب بھی پتھرائی نظروں سے رات گئے تک گھنٹوں کسی کا انتظار کرتی ہے ۔ وہ بے وفا میں ہی تو ہوں ۔ اس خیال سے میرا وجود اور بھی زخمی ہو گیا۔

عالم بے خودی میں اس بچہ کو پاگلوں کی طرح چومتا دیکھ کر اطراف کے لوگوں کی بھیڑ اکٹھی ہوگئی تھی ۔ میری اس کیفیت کی سچائی سے

ہر تماشائی بے خبر تھا۔ کتنے ہی آنسو میری آنکھوں سے نکل کر اس بچے کے الجھے ہوئے بالوں میں مدغم ہو گئے تھے۔ میری نظروں سے غبار شرمندگی چھٹ چکا تھا۔ صرف روبی کا مسکراتا ہوا چہرہ ہی اسکا مرکز بنا ہوا تھا۔ نجانے اس وقت مجھ میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی۔ میری ان حرکتوں پر بچہ مجسمۂ حیرت بنا بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی اطراف کے لوگوں کو دیکھتا کبھی مجھے۔ اسکا چہرہ سوالیہ نشان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

گاڑی اب بھی نہیں آئی تھی۔ مجھے اب اس گاڑی کا نہیں کسی دوسری گاڑی کا انتظار تھا جو مجھے روبی تک پہنچا دے۔

☆☆☆

المیہ

نیلما! تم تو میرے خیال سے، میری روح سے اس طرح لپٹ گئی ہو جس طرح پھول سے خوشبو، ساز سے دھنیں، الفاظ سے سیاہی اور پتوں سے رنگ۔ اب بتاؤ کیا تم مجھ سے دور ہو۔ کتنی قریب ہو تم مجھ سے۔ بہت بہت قریب اتنی قریب کہ مجھے دو دلوں، دو جسموں کا احساس تک نہیں۔ میری ہر سانس اب تمہاری یاد بن گئی ہے۔ میرے تصور کی تصویر میں تمہاری پرچھائیں، تمہارا وجود، اک آس، اک امید لئے لمحہ دو لمحے مسرت کی لہر پیدا کرتے ہیں۔ اب بتاؤ اتنی قربت کے باوجود بھی تم مجھ سے بدگمان کیوں ہو؟

نیلما! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری زبان میرا قلم ہے۔ یہ میرے احساسات کا مترجم ہے۔ تم نہیں جانتی میں اپنے تصورات کی وادیوں میں تمہارے ساتھ کہاں کہاں کی سیر کرتا ہوں۔ تمہاری قربت میرے لئے رگ جاں کے لہو سے کم نہیں۔ قدرت کے حسین نظاروں میں سرخ لبادہ اوڑھے تم ٹیسو کی ڈالی نظر آتی تھیں۔ تب مجھے اپنی تقدیر پر ناز ہوتا تھا۔ کہ خدا نے میری زندگی کی خاردار جھاڑی میں کتنا حسین پھول کھلا دیا ہے۔

نیلما! اب بتاؤ۔ اتنا قریب بلکہ روح کی گہرائیوں میں اتر جانے کے باوجود بھی تم کیوں مجھ سے بدگمان ہو۔ کیوں تمہارے لب مجھے دیکھ کر تھرتھرانے لگتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ کئی دن سے، محسوس کرتا ہوں،

تمہاری وہ نشہ انگیز مسکراہٹیں نہیں رہیں۔ وہ والہانہ محبت نہ رہی۔ دل کی گہرائیوں کو چھونے والی باتیں، وہ غمزے وہ انداز نجانے کہاں کھو گئے۔ تمہاری زبان سے اب ہمیشہ شکوے شکایتیں چنگاریاں بنکر نکلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس کے لئے میں قصوروار ہوں میری بدحالی میری غربت قصوروار ہو۔ میری زبان بھی اب میرے بس میں نہیں رہی۔ ہاں میرا ایک ساتھی اب بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ ہے میرا قلم جو سدا ہی بازگشت کی طرح تم تک پہنچ جاتا ہے۔ میرا قلم میرے جذبوں کا عکاس ہے۔ میرا اپنا مترجم ہے۔ نیلما! وجود جو میرا تھا وہ اب میرا نہ رہا۔ سب تمہارا ہو گیا۔ مجھے کیا ہو گیا ہے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھ میں تم بس گئی ہو۔ ہر لمحہ اپنے تصور میں تمہاری صورت دیکھتے دیکھتے میرا شعورِ نظر مجھ سے ہی اجنبی ہو گیا ہے۔ زندگی کی راہوں میں سنگ حوادث سے ٹکرا کر میرا وجود پاش پاش ہو گیا ہے۔ مگر اب بھی میرے خون کے قطرے میرے دل کے شفاف ورق پر تمہاری ہی تصویر بناتے رہتے ہیں۔ سرخ سرخ بے شمار تصویریں۔ نیلما! مجھے اس وقت بڑی کوفت ہوتی ہے جب تم میری مفلسی کا مذاق کچھ عجیب انداز میں اڑاتی ہو۔ یہ مفلسی تو میری زندگی کا کفن بن چکی ہے۔

نیلما! عہدِ ماضی کے وہ رنگین لمحات، وہ سنہری ساعتیں اب بھی مجھے یاد ہیں۔ تمہاری یادیں ہولے سے کروٹیں لے رہی ہیں۔ میں ایک عجیب سی مسحور کن فضا میں محوِ پرواز ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے، وہ رنگین لمحہ، وہ یادگار پل جب پہلی بار ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ کچھ عجیب انداز میں۔ ریل کا سفر رات کا مہیب سناٹا۔ احمد پور کا سنسان پلیٹ فارم جہاں

پنجاب میل صرف چند سیکنڈ کے لئے سانس لیتی ہے۔ دو کبھی نہ ملنے والی پٹڑیوں پر رینگتی پنجاب میل۔ چلتی ٹرین میں میں غلطی سے تمہارے ریزرو کوچ میں چڑھ آیا تھا۔ نیم خوابی غزالی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ تمہاری آنکھوں میں حقارت کا تاثر پہلے میں نے کسی آنکھ میں نہیں دیکھا تھا۔ میری معذرت نے نجانے تم پر کیا اثر کیا کہ تم نے مجھے اگلے اسٹیشن تک بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ کس قدر سحر انگیز تھے وہ لمحات۔ عطر و بیز کی خوشبو سے سارا کمپارٹمنٹ زعفران زار بن چکا تھا۔ تمہارے ہم سفر رشتہ دار محوِ خواب تھے۔ مگر نجانے کیوں تمہاری آنکھیں بے خواب تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے کسقدر مسرّت ہوئی کہ تمہاری خوبصورت انگلیوں کے درمیان نیم وا میرا حالیہ ناول ''پلکیں'' مسکرا رہا تھا۔ اپنی تحریر پر اس وقت حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے پتھر کی تراشیدہ مورت میں گہرے جذبات کے آثار نمایاں کر دئے تھے۔ یہ کیسی روشنی تھی جس سے میری تقدیر کے اندھیرے بھی منور ہونے لگے تھے۔

تم نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا تھا۔ اور بڑی لاپرواہی سے کہا تھا ''جناب کا تعارف؟ جی! جی! مجھے مجیب سرورؔ کہتے ہیں۔ بہ مشکل تمام میری زبان سے جملہ ادا ہوا تھا۔ شاید آپ نے مجھے کہیں پڑھا ہوگا۔ ایک جھٹکے سے آپ برتھ پر بیٹھ گئی تھیں اور کہا تھا ''اوہ آپ، مجیب سرورؔ! آپ۔ آپ تو میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔ کتنی چمک تھی تمہاری آنکھوں میں۔ اجنبیت یک لخت غائب ہوگئی تھی۔ کس قدر اپنائیت تھی تمہاری آواز میں۔ نجانے کتنے ہی خواب میری ویران آنکھوں نے اس وقت دیکھ ڈالے تھے۔ پھر تو تم نے میری تخلیقات، میرے قلم کی

روانی، لہجہ طرزِ فکر اور انداز بیاں میں ثنا خوانی کر کے زمین آسمان کے قلابے ملا دئے تھے۔ میں تو جیسے تصورات کے سمندر میں غرق ہو گیا تھا۔ کتنے ہی اسٹیشن آئے اور گزر گئے۔ یہ کیسی کیفیت تھی کہ ہم ایک دوسرے میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔ وہ کیسا پل تھا کیسی ساعت تھی جس کے سہارے میری آبدیدہ نظر نے کتنی تمنائیں اپنی آغوش میں سجالی تھیں۔ اتفاقاً تمہارا نام بھی وہی تھا جو میرے افسانوی کرداروں میں مرکزی روپ میں ہوا کرتا تھا۔

وہ سفر تو تمام ہو گیا مگر تمنائیں جنم لیتی رہیں۔ تمہاری قربت نے مجھے نئی زندگی بخشی۔ میں بھول گیا تھا نیلمؔا کہ میرے اور تمہارے درمیان دولت وغربت، اونچ و نیچ کی گہری کھائی حائل ہے۔ تم صاحب ثروت باپ کی بیٹی اور میں سڑکوں پر بھٹکتا بدحال قلمکار۔ زندگی وقت کے سمندر میں محوِ خرام تھی۔ یہ دنیا انقلاب کی گود میں پلتی ہے۔ میری دنیا میں کیسے کیسے حالات کروٹیں لیتے رہے۔ مفلسی کے قاتل سائے میرے وجود پر منڈلاتے رہے۔ تمہارے عہد و پیمان، تمہاری محبت میری راہوں کی تیرگی میں شمع امید کی طرح تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ رفاقت انوکھا انداز اختیار کرنے لگی۔ تمہاری محبت بھی موسموں کی طرح کئی رنگ بدلتی رہی۔ میرا قصور بس یہی تھا کہ میں تمہارے سماج تمہاری سوسائٹی کے ہمسر نہ تھا۔

نیلمؔا! اب بھی ٹوٹے ہوئے دل میں ایک آس ایک امید ہے صرف تمہیں پانے کی۔ گو کہ میں حالات کی موجوں میں بہہ کر تم سے بہت دُور آ گیا ہوں۔ مگر تمہاری محبت اور تمہارے حسن کی حرارت اب بھی مجھے تمہاری قربت میں لئے ہوئے ہے۔ تمہیں نہیں معلوم میں نے تمہاری

تصویر سے کتنی باتیں کی ہیں، میں نے اس خموش پرچھائیں کے سامنے اپنے تمام راز فاش کردئے ہیں۔

نیلما! میں دنیا کا سب سے بدنصیب انسان ہوں۔ کیونکہ میرے پاس دولت نہیں ہے۔ تمہاری خواہشات کے مطابق تمہیں عیش و آرام کی زندگی سے ہم کنار نہیں کرسکتا۔ اب تو میرا وجود مٹی کی پرتوں میں کھوسا جارہا ہے۔ دنیا میں میرا ماں اور تمہارے سوا کوئی نہیں تھا۔ ماں تو مجھے اکیلا چھوڑ کر یادوں کے پردوں میں کھوگئی۔ اب میں تنہا ہوں۔ میرے ساتھ تمہارا تصور، میرے بے رنگ سپنے اور میرا قلم ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں میری مفلسی کہیں تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔ اور اگر ایسا ہوا تو لگتا ہے آسمانوں میں بسنے والا خدا زمین پر بسنے والے مجھ جیسے بدنصیبوں سے بہت ناراض ہے۔ نیلما! سب مجھ سے ناراض ہوجائیں۔ مگر تم کبھی مت روٹھنا۔ ورنہ۔ میری زندگی کا پھول موت کی آندھی میں منتشر ہوجائیگا۔

میں کوشاں ہوں کہ جلد ہی تم سے ملوں۔ نجانے وہ مبارک ساعت، وہ مسحور کن لمحہ پھر کب نصیب ہوگا جب میں تمہارے روبرو ہوسکونگا۔ امید کرونگا کہ تمہاری منتظر نگاہیں راہوں میں چادرِ انتظار بچھائے اب بھی محوِ تمنا ہونگی۔

منتظرِ دید!!!

مجیب سرور

انسپکٹر شہاب نے پنجاب میل سے لائی گئی کچلی ہوئی لاش کا معائنہ کیا۔ انھیں لاش کے ساتھ ایک بوسیدہ سی تھیلی میں رکھے چند کاغذات اور نیلما کی تصویر کے گرد لپٹا ہوا درجِ بالا سطور سے مزین ایک رقعہ بھی ملا

تھا۔ یہ خط مجیب کا دل تھا۔ اس کی تمناؤں کا غماز تھا۔ جو نیلما تک نہ پہنچ سکا تھا۔ نجانے کیوں؟ مگر اس کا سبب انسپکٹر شہاب جان گئے تھے۔ نیلما نے نہ سہی انسپکٹر شہاب نے مجیب کی خون سے لکھی تحریر بار بار پڑھی۔ ان کی آنکھوں سے کئی قطرے نکل کر مجیب کے خون آلود بوسیدہ پیرہن میں جذب ہوتے رہے۔ اب بھی قلم مجیب کی قمیض میں ٹھیک دل کے قریب لگا تھا۔ مگر قلم کا پرستار یہ دل دھڑکنوں سے سدا کے لئے محروم ہوگیا تھا۔

وہ رات بیحد طوفانی تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھکڑ جسم کو یخ بستہ بنائے دے رہے تھے۔ آسمان پر گھٹائیں گھر آئی تھیں۔ ماحول درد میں ڈوب کر مزید مہیب ہو چکا تھا۔ ماحول کی یہ کیفیت شاید شہاب کے احساسات کا عکس تھی۔ انپکٹر شہاب کی زندگی میں اس قسم کے ہزاروں کیس آئے تھے۔ سینکڑوں ایکسی ڈنٹس کی رپورٹ اس کے ہاتھوں تیار ہوئی تھیں۔ مگر مجیب کی زندگی کا المیہ اپنی نوعت کا منفرد المیہ تھا۔ جس کا تعلق شہاب سے براہ راست تھا۔ مجیب سرور شہاب کا بھی من پسند رائیٹر تھا۔ اس کے کتنے ہی افسانے شہاب کی نظر سے گزرتے تھے۔ مجیب کے قلم کی ہر تخلیق شہاب کے دل کی آواز تھی۔ اس فرشتہ صفت، معصوم زندگی کا اس قدر دردناک انجام اس کا ہر خیال ہر لمحہ اسے پاگل کئے دے رہا تھا۔ اسکا ضمیر اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ اب بھی اس کے ہاتھوں میں نیلما کی تصویر اور سامنے مجیب کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش تھی۔ مجیب کی موت قلم کی موت تھی۔ وہ مجیب جس نے محبت کرنے کا جرم کیا تھا۔ جس نے کانچ کے سپنوں کو اپنی پلکوں پر سجانے کا قصور کیا تھا۔ شہاب کو اپنا وجود افق پر ڈولتے ہوئے تارے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

مجیب کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد قبرستان بھیج دی گئی ۔ رات پُر ہول تھی ۔ ماحول پر غم کا کہرہ چھایا ہوا تھا۔ شہاب بستر پر دراز تھا، مگر اسکی آنکھیں نیند سے کوسوں دور تھیں ۔ اسکی خوبصورت بیوی نیلماؔ جسے اسکی زندگی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے بڑی ہی انسیت سے اسکی طرف دیکھ رہی تھی ۔ شہاب کا چہرہ سوکھ چکا تھا۔ کرب کی لکیریں اسکی پیشانی پر نمایاں تھیں ۔ لگ رہا تھا گویا وہ طویل سفر طے کر کے آ رہا ہے ۔ مگر نیلماؔ پرسکون تھی ۔ وہ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی بار بار شہاب سے اداسی کا سبب پوچھ رہی تھی ۔ اور وہ ہر بار ٹال جاتا۔ نیلماؔ کی نرم و نازک انگلیاں شوہر کے سر سے اٹکھیلیاں کرتی رہیں ۔

رات کا تیسرا پہر بیت گیا۔ مگر اب بھی شہاب کی آنکھیں نیند سے بے نیاز تھیں ۔ بیقراری اس کے اعصاب پر مسلط تھی ۔ غمزدہ احساس کے سائے اس کے چہرے پر اور بھی گہرے ہو چلے تھے ۔ مگر نیلماؔ ان تمام تفکرات سے بے نیاز خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی ۔ اسکی سیاہ پریشاں زلفوں نے اس کے چاند سے مکھڑے کو آراستہ کر رکھا تھا۔ اسکا چہرہ کسقدر معصوم تھا۔ اس پر دکھ کی پرچھائیں نام کو نہیں تھی ۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہابؔ اسکا شوہر اس کے پیار کے پیاسے محبوب مجیب کو زمین کی پرتوں میں دفن کر کے آ رہا ہے ۔ وہ اس خیال سے بھی کوسوں دور تھی کہ آج ایک قلم کی ہی نہیں ایک احساس، پاکیزہ احساس کی موت ہوئی ہے ۔ شہاب سوچ رہا تھا۔ عورت بھی کیا چیز ہے ۔ اس کے کتنے روپ ہیں ۔ یہ بیک وقت رادھاؔ بھی ہے ۔ مریمؔ بھی اور ۔ ۔ اور نیلماؔ بھی ۔ اس کا دل اب بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ رہ رہ کر مجیب کا

معصوم چہرہ، اس کی خون سے لکھی تحریر کا ایک ایک لفظ اسے یاد آرہا تھا۔
وہ اپنے وجود کو بھی منوں مٹی کے بوجھ تلے محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔مگر۔۔
نیلما کی مدہوش اور نیم وا بانہیں اب بھی غم سے بے نیاز تھیں اور اسکی بوجھل پلکوں پر کئی خواب مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

لمحہ لمحہ زندگی

میرے سامنے دُور دُور تک ایک سنسان، ویران جنگل پھیلا ہوا تھا۔ ہراساں حزن و ملال کو اپنے چہرے سے چپکائے بوجھل قدموں سے میں چل رہا تھا۔بس چلتے رہنا میری عادت بن چکی تھی۔ میرے وجود سے اداسیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ پیروں میں ٹیڑھے میڑھے راستوں کی زنجیر بندھی تھی۔لبوں پر تشنہ کامی کا تسلط تھا۔ذہن کیا تھا۔اک شہرِ خیال تھا۔دل کی دنیا سناٹوں کی رہگزر بن چکی تھی۔ مگر میں پھر بھی چل رہا تھا۔

اچانک مجھے ایک شاہ راہ کا سراغ ملا۔ حالانکہ یہ سڑک بھی تنگ اور خار آلود تھی۔ پھر بھی جنگل میں رینگتی ہوئی پگڈنڈیوں کے مقابلہ میں اسے شاہ راہ کہا جاسکتا تھا۔اس راستہ سے لوگوں کا جمِ غفیر گزر رہا تھا۔جس میں بوڑھے،نوجوان، بچے،لڑکے،لڑکیاں،عورتیں بھی شامل تھے۔ یہ سب سرعت سے نجانے کہاں جارہے تھے۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا''کیوں بھائی! آپ لوگ جوق در جوق کہاں جارہے ہو'' مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہر شخص انتہائی عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔

چند لمحے اپنی محرومی پر افسوس کرتا ہوا میں سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ سڑک کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں،اونچے اونچے پہاڑ اور بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔راستے میں جابجا نکیلے پتھر اور کانٹے بکھرے پڑے تھے۔اس راستے پر میں نے دیکھا کئی خوبصورت بدن لہولہان ہوگئے تھے۔ پتھروں پر سُرخ شبنم بکھری ہوئی تھی۔ پھر بھی لوگوں کا یہ سیلاب رواں دواں تھا۔

بغیر سوچے سمجھے، برگِ آوارہ کی طرح میں بھی اسی سمت ہولیا جس سمت لوگ جا رہے تھے۔ ایک مسافرِ بے منزل کی طرح میں بھی قدم بڑھا رہا تھا۔ اتنے سارے ہم سفر پھر بھی ہر طرف خموشی چھائی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی کسی درد کے مارے کی صدائے دلخراش گونجتی اور خاموشی کے سمندر میں ڈوب جاتی۔ پھر وہی سناٹا، وہی مسلسل خاموشی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا سڑک سے ملحق ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی۔ جس میں دُور دُور تک تنہائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ دفعتاً دور ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ جیسے جیسے پگڈنڈی کا آخری سرا جو شاہراہ سے جڑا ہوا تھا قریب ہوتا گیا وہ سایہ بھی واضح ہونے لگا۔ جیسے ہی میں اس موڑ پر پہنچا وہ سایہ میرے سامنے تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ صبح روشن کی طرح سفید لباس زیب تن کئے وہ انتہائی خوبصورت دوشیزہ تھی۔ اسکا تر و تازہ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ چند ثانیئے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں اسکے جمال میں کچھ اسقدر کھویا کہ خود کی خبر نہ رہی۔ سفر کی ساری کلفتوں کو فراموش کر کے میں حسن کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یکبارگی اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ ترنم کے سوتے پھوٹ نکلے۔ چند لمحوں میں میں جذبوں کا سارا سمندر کھنگال آیا تھا۔ اس نے کہا ''میرے رہبر مجھے اپنی ہمسفر بنالو۔ میں تمہارے نقشِ قدم پر چلنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ تمہارے قدم منزل شناس ہیں۔'' یہ سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ ایک عجیب سی صدا لفظوں میں ڈھل کر میرے وجود سے باہر نکلی۔ میں نے کہا ''میرے نقشِ قدم پر .... میرا تو کوئی نقش ہی نہیں ہے۔ میں تو ایک مسافر ہوں جس کے قدموں سے آوارگی لپٹی ہے۔ میری کوئی منزل نہیں۔ میں کیسے تمہاری رہنمائی کرونگا۔ نہیں، نہیں!! یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اس نے اپنی گھنی دراز پلکوں کو ہلکے سے جنبش دی۔ کئی خواب مسکرا اٹھے۔ کہنے لگی میرے بزرگ غلط نہیں کہہ سکتے۔ انھوں نے مجھے ہدایت دی ہے کہ پگ ڈنڈی کے آخری سرے پر جو شخص سب سے پہلے مجھے ملیگا وہ میرا اچھا رہبر ہوگا۔ تم ہی میرے رہبر ہو۔ میں تمہارے بغیر کتنی بھٹکی ہوں تمہیں کیا معلوم۔ اسکی آواز رندھ سی گئی۔ کنول سی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ میں نے دیکھا اسکی سیاہ دراز زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ سنگ مرمر کے سے تراشیدہ پیر زخمی ہو گئے تھے۔ بت بنا میں دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

ایک بار مجھے اپنی صحرانوردی کے پہلے کی زندگی کے وہ ایام یاد آگئے جو میں نے طاہرہ کے ساتھ مل کر گزارے تھے۔ طاہرہ کے حسن میں کھو کر میں اپنے اطراف پھیلی ہوئی کائنات کو بھی فراموش کر بیٹھا تھا۔ مگر طاہرہ مجھے ماہی بے آب کی طرح تنہا تڑپتا ہوا چھوڑ کر نجانے کہاں روپوش ہوگئی تھی۔ اور میں اپنی وفا کو سینہ سے لگائے غبار راہ کی مانند بھٹک رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے عورت کے وجود سے نفرت ہوگئی تھی۔ مگر... مگر آج عورت کا یہ روپ دیکھ کر میرے حواس باختہ ہوگئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا ڈوبتے ہوئے میرے ہاتھ کنارہ لگ گیا ہو۔

نشیب دل سے میری صدا ابھری۔ میں نے اس سے کہا آؤ ہم بھی اسی سمت چلتے ہیں۔ جدھر سب لوگ جارہے ہیں۔ اس نے جھک کر کہا میرے رہبر میں تمہارے نقش قدم پر چلنا چاہتی ہوں۔ میں نے تقریباً چیخ کر کہا "نہیں نہیں! میں تمہارے نقش قدم پر چلونگا۔ دراصل میں اس کے قدموں کی جنبش پر اپنی منزل کا تعین کرنا چاہتا تھا۔ میری بات مان کر وہ چلتی رہی۔ اس کے قدم خون اگلتے رہے۔ جسم شرابور ہوتا رہا۔ چہرہ اشکوں میں ڈوبتا رہا۔ پھر بھی وہ چلتی رہی۔ مجھے اب بھی نہیں معلوم تھا کہ میں اس اجنبی کے ساتھ کہاں جارہا ہوں۔

تھکن کے بوجھ سے اس کے نازک قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ میری بانہوں نے اسے سنبھال لیا۔ میں نے دیکھا اب ہمارے اطراف کوئی نہ تھا۔ شاید ہم سب سے آگے نکل آئے تھے۔ راستہ ویران تھا۔ مگر چار سُو مہکتی وادیاں تھیں۔ نجانے کیوں اب یہ کائنات مجھے حسین لگ رہی تھی۔ اپنے حواس پر قابو پا کر میں نے اس سے پوچھا ''تم کون ہو؟ مجھ سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟

اس نے میرے بازو سے اپنا سر اٹھایا۔ اسکی آنکھوں میں ماہتاب ابھر آئے تھے۔ اسکا جسم گیندے کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اسکا لباس عطر کی طرح مہک رہا تھا۔ نجانے اس کے زخم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ دور دور تک پہاڑوں کی چوٹیاں گنگنا اٹھیں۔ ترنم کی کئی لہریں فضاؤں میں بکھر گئیں۔

اس نے بڑی معصوم ادا سے کہا ''تم بڑے بھولے ہو۔ مجھے بھی بھول گئے۔ میں.. میں تمہاری زندگی ہوں۔ اور یہ سڑک جو تم دیکھ رہے ہو یہ... یہ جادۂ حیات ہے۔ سفر ہی اسکا مقدر ہے۔ جہاں مسافر رک گیا وہی اسکی منزل ہے۔

تم خوش نصیب ہو جو تم نے مجھے کھو کر بھی پا لیا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اسکا وجود سحر انگیز خوشبو میں بدلنے لگا۔ میں زندگی کی رعنائیوں میں کھو چکا تھا۔ مگر خود کو پا لیا تھا۔

☆☆☆

تجدیدِ محبت

شہر سے کچھ فاصلے پر تارکول کی زخمی سڑک کے کنارے ویرانیوں میں کھویا ہوا مغل گارڈن ادھر اُدھر بکھری ہوئی خالی بنچیں اشوک اور پام کے پیڑ جو صدیوں کا کرب خود میں چھپائے خاموش کھڑے تھے۔ اطراف خشک جھیل، دور شام دن کی بانہوں سے لپٹ کر رخصت ہو رہی تھی۔ افق کے رخسار شفق گوں ہو گئے تھے۔

شام کا دھندلکا گہرا ہو چلا تھا۔ ہر شے پر اداسی چھانے لگی تھی۔ کچھ سائے گارڈن میں بکھری بنچوں پر دُور دُور بکھرے بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً سبھی اپنی اپنی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ شاید مغل گارڈن بکھری تمناؤں اور اداس جذبوں کی آماجگاہ تھا۔ یہاں وہ لوگ نظر آتے ہیں جو دنیا کی گہما گہمی سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔

آمنے سامنے ذرا فاصلے پر بچھی بنچوں پر دو سائے بڑی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ دونوں ہی سوچ کے سمندر میں غرق تھے۔ ایک سایہ کسی خاتون کا تھا دوسرا کوئی مرد نظر آتا تھا۔ دونوں ہی بجھے بجھے دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں کی نگاہیں فضا میں کچھ تلاش کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ دونوں کے چہروں پر بے چینی اور اضطراب کی سی کیفیت کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

دھندلکا اور گہرا ہو چلا تھا۔ اچانک دونوں سائے اپنی اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں ہی اپنے سامنے کی سمت چلنے لگے

۔تقریباً دس دس قدم چلنے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔سکوت ٹوٹا۔

ہیلو!....ہیلو! مجھے سنیل ... سنیل کمار شریواستو کہتے ہیں۔آپکی تعریف و جی ... جی .. مجھے ... میرا نام انیلا شرما تھا۔اوہ! مجھے انیلا کہتے ہیں ۔اچھا۔آپ سے مل کر مسرت ہوئی ۔ میں بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں آپ کچھ اداس اداس سی نظر آرہی ہیں۔نجانے کیوں ویسے آج...میرا موڈ بھی...!

سنیل جی !زندگی کی خوشیاں بڑی بے وفا ہوتی ہیں۔ پل بھر ساتھ رہ کر انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دکھوں کے غار میں چھوڑ جاتی ہیں۔رمیش اور میں اسی باغ میں ملے تھے۔ ہمارا پیار آٹھ ماہ قبل شادی میں بدل گیا تھا۔میں انیلا شرما بن گئی تھی۔اور آج ہماری طلاق ہوگئی ہے۔ آخری بار اس مقام کے دیدار کو آئی تو یادوں کے بھنور میں کھوگئی تھی۔''

انیلا جی ، عجیب بات ہے ایک انوکھا اتفاق ہے میری اداسی کا سبب بھی ٹھیک تمہاری کہانی کا عکس ہے۔نیتو! میرا بیتا ہوا خواب ہے۔ گزرا ہوا کل ہے۔ہم نے اسی باغ میں ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ توڑ کر نیتو مجھے تنہائیوں کے سہارے چھوڑ کر چلی گئی۔آج ہی کورٹ میں ہماری طلاق ہوگئی۔دل پر کرب کا بوجھ لئے میں ادھر چلا آیا تھا۔اب تو یہ ہے کہ اپنی تقدیر پر نہ ہنس سکتا ہوں نہ رو سکتا ہوں۔

دونوں سائے بہت قریب ہو گئے تھے۔خاموش! خاموش!! مگر نگاہوں کی گفتگو جاری تھی۔کوئی اس گفتگو کو سمجھ نہیں پایا۔اگلے ہی پل

دونوں سائے ایک دوسرے میں سما گئے ۔ ایک دوسرے میں کھو گئے ۔

فضائیں چاندنی کا لباس پہن کر پوری طرح آراستہ ہو چکی تھیں ۔ ہر شے سنہری آنچل میں کھو چکی تھی ۔ کائنات پر مدہوشی طاری تھی ۔ اب بھی ہلکی ہلکی سسکیاں گارڈن کی خاموش فضاؤں میں گونج رہی تھیں ۔

☆☆☆

عید کارڈ

دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد سورج شام کے شانوں پر گرم گرم سانسیں لے رہا تھا۔ شفق کے رخسار سرخی مائل ہونے لگے تھے۔ ہواؤں میں ایک قسم کا ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ پرندے دن بھر کا دانہ دنکا لیکر اپنے اپنے گھونسلوں کی سمت لوٹنے لگے تھے۔ میں اپنی سوچ اور فکر کے آنگن میں نجانے کب سے کیا کیا تانا بانا بن رہا تھا۔ گزرے ہوئے حالات اور واقعات کی بیشمار کرچیاں میرے سامنے بکھری پڑی تھیں۔ سوچ کے ان دائروں سے میں فرار چاہتا تھا۔ کچھ سوچ کر میرے قدم بازار کی سمت چل پڑے۔ روزہ افطار کے بعد نماز مغرب ہوچکی تھی۔ مسجد کے سامنے والی سڑک سے ملحق میدان میں لگی نان اور کباب کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں کافی بھیڑ تھی۔ چائے کی اسٹالوں میں لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شاید ملک کی موجودہ سیاست اور حالات حاضرہ ہی موضوع بحث تھے۔ میں ان پر سرسری نظر ڈالتا ہوا بے خیالی میں سڑک کے موڑ پر ہولیا۔ اب بھی میرے وجود سے تنہائیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اچانک میری نظر سڑک سے لگی ایک دوکان پر پڑی جہاں ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی میں بے شمار عید کارڈ دیواروں پر الماریوں میں، شوکیسوں میں اور درمیان پڑی ٹیبلوں پر آویزاں تھے۔ نجانے کیا سوچ کر میں اس دوکان میں داخل ہوگیا۔

مختلف رشتوں سے منسوب عید کارڈ، ان کی پیاری پیاری رنگ

برنگی تحریریں اور خوبصورت ڈیزائن دیکھ کر پردیس کی اس ویران اور بے کیف جگہ میں مجھے بھی دور دراز بسنے والے اپنے رشتہ دار، عزیز و اقارب یاد آ گئے۔ پل بھر میں اپنی ویرانیوں کا احساس بھلا کر وہ دوکان مجھے جنت نما نظر آنے لگی تھی۔ دفعتاً میں نے رشتوں کی مناسبت سے اپنی پسند کے کارڈ منتخب کرنے شروع کر دئے۔ یہ کارڈ میری چھوٹی بہن یاسمین کے لئے اس کے شوہر اور بچوں کے لئے جو ممبئی میں رہتے ہیں۔ کتنا دلکش ہے یہ کارڈ اسے پا کر اس کی عید کی خوشیاں دوبالا ہو جائینگی۔ یہ کارڈ بھوپال والے چچا جان کے لئے خوب رہے گا۔ ہر سال میرا عید کارڈ پا کر انھیں کتنی خوشی ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ لکھتے ہیں تمہارے عید کارڈ کے بغیر ہماری عید ادھوری رہتی ہے۔ چچا زاد بھائی حفیظ اور رضوان بھی تو منتظر رہتے ہیں اور پھر بھوپال کی عید تو عید ہوتی ہے۔ دیوار کے اس سرے پر لگا سرخ پھول والا وہ کارڈ امّی کے لئے۔ عید پر گھر تو نہیں جا سکتا یہ کارڈ ہی میری موجودگی کا احساس کرا دیگا۔ اور سلیم بھی تو میرے عید کارڈ کا بڑی بے چینی سے منتظر رہتا ہے۔ میری تحریر کے بغیر سارا گجرات اسے راجستھان کی ریت کی طرح بے نور نظر آتا ہے۔ امین بھائی جو کانپور میں رہتے ہیں اور ان کی بہن جو لکھنو میں رہتی ہے کتنے مخلص ہیں یہ لوگ۔ امن و اخوت اور محبت کے پیکر۔ کیوں نہ ایک کارڈ انھیں بھی بھیج کر ان کی خوشیوں میں شریک ہو جاؤں۔ حیدر آباد کی پیاری خالہ، نسرین اور دلاور بھائی بھی مجھے یاد آئے۔ تمام کارڈ اکٹھے کرنے کے بعد میں نے ان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اچانک ایک خیال بجلی بن کر میرے ذہن پر کوندا۔ خود فریبی کی دھند چھٹنے لگی اور حالات کی سچائیاں منکشف ہونے لگیں۔ ایک بے ہنگم

سوچ نے پھر سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ مجھے اپنا وجود فضا میں اڑتے ہوئے اس غبارے کی طرح محسوس ہونے لگا جسکی ڈور کٹ گئی ہو۔ میرے ذہن میں خیالات کا بھیانک سیلاب موجزن تھا۔

میرے ہاتھ میں وہ عید کارڈ تھا جسے میں اپنی بہن یاسمین کو بھیجنے والا تھا، اس بہن کو جسکا سب کچھ پچھلے فساد کے موسم میں اجڑ گیا تھا۔ انسانیت اور بھائی چارہ کے دشمنوں نے اسکا گھر جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ زخموں کی تاب نہ لاکر اسکا ٦ سالہ انور اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اسکی دنیا اجڑ گئی تھی۔

اسی طرح بھوپال میں چچا جان اور انکا خانوادہ بھی فسادیوں کے ظلم کا شکار ہو چکا تھا۔ ان کے دونوں نوجوان لڑکے اس بڑھاپے میں انہیں اس ملک کے سیکولرازم کے نام پر داغ مفارقت دے گئے تھے۔ حیدرآباد کی پیاری خالہ اور احمد آباد میں سلیم کا گھرانہ فسادیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ کانپور اور لکھنؤ میں فساد کی اس بے رحم آندھی نے امین بھائی اور ان کی بہن پر وہ قہر ڈھایا کہ جمہوریت برہنہ ہوگئی۔ آئین کی دھجیاں اڑ گئیں۔ مساوات کا کھوکھلا نعرہ لگانے والے بے نقاب ہو گئے۔ فسادات کا یہ موسم میرے عزیزوں کے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا۔ دل میں ان زخمی یادوں کے ابھرتے ہی میرا وجود زہر آلود ہو گیا۔ میری ہر سانس سے شدید نفرت کی بو آنے لگی۔ اس جمہوریت سے نفرت جسے انسانی رشتوں کی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔

فساد کا یہ موسم اور عید کی خوشیاں ٹھیک ایسی ہی ہیں۔ جیسے ماتمی ماحول میں شہنائیاں، بربادیوں پر جشن... میری آنکھوں سے دو آنسو نکل

کر عید کارڈ کے ڈھیر میں دفن ہو گئے۔ میرا وجود ایک بار پھر سناٹوں کی رہگزر بن چکا تھا۔ میں اپنے احساس کے مرقد میں پھر سے دفن ہو جانا چاہتا تھا۔

عید کارڈ کے اس ڈھیر میں سے صرف ایک کارڈ اٹھا کر میں دوکان سے نیچے اتر آیا۔ یہ کارڈ دہلی میں رہنے والے میرے دوست گوری شنکر کے لئے تھا۔ جس نے دوران فساد ملک کی راجدھانی میں میری بھابی اور بھائی کو اپنی امان میں رکھ کر ان کی آبرو کی حفاظت کر کے انسانیت کا ایک ایسا دیا روشن کیا تھا جس سے اندھیروں میں بھٹکنے والے ہزاروں لوگ روشنی پا سکتے ہیں۔ اپنی ذات کا تعین کر سکتے ہیں۔

رات کے اندھیرے میں جھل مل کرتی ہوئی عید کارڈ کی دوکان دُور سے سراب کی مانند نظر آ رہی تھی۔ رشتوں کا سراب۔ میرے بڑھتے ہوئے قدموں کے تناسب میں رفتہ رفتہ وہ ایک نقطہ میں تبدیل ہو کر تاریکیوں میں مدغم ہو گئی۔!!

☆☆☆

یادیں لہولہان

آج کی شام کس قدر اداس تھی۔ آسمان کی پیشانی سے رستا ہوا لہو جھیل کے خاموش پانی کو بھی لہو لہان کر رہا تھا۔ دور دور تک ماحول پر اداسی کے گہرے سائے مسلّط تھے۔ اطراف کی ہر شے سے کرب کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہواؤں نے ماحول کو ماتمی بنا دیا تھا۔ اس کے بدن سے سناٹے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ آج خود کو کسقدر تنہا محسوس کر رہا تھا۔ٹھیک اس پیڑ کی طرح جو دہکتے ہوئے ریگستان میں تنہا کھڑا ہو۔ اس نے جھیل کے اطراف اپنی مایوس نگاہیں دوڑائیں۔ اطراف کے پیڑ، پودے، سنگریزے بھی... سبھی آج اسے اجنبی سے لگ رہے تھے۔ وہ سوچ کی لہروں میں کھویا شہر سے دور نکل آیا تھا۔ جھیل کا یہ خاموش کنارہ جو کبھی نجمہ کے قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا، نجمہ کے فقرئی قہقہے۔مگر آج... لہولہو اس آسمان کے نیچے، جھیل میں پھیلتے دائروں کے ساتھ ساتھ اس کے ماضی کی بے شمار یادیں بھی کروٹیں لینے لگی تھیں۔ اس احساس سے اس کے افکار بھی زخمی ہوگئے تھے۔

جھیل کی خاموش، پرسکون سطح پر دائرے بن بن کر سمٹ رہے تھے۔ یہ دائرے ایک نقطہ سے شروع ہو کر نجانے کہاں غائب ہو جاتے۔ اور پھر ٹھیک اسی مرکز سے نجمہ کا حسین تصور رنگین یادوں کا کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد پرندے اپنے اپنے گھونسلوں کی سمت لوٹنے

لگے تھے۔ سورج رخت سفر باندھ چکا تھا۔ شام زینہ زینہ اتر رہی تھی۔ اس کی مانگ میں بھری شفق کی سرخی سے سارا ماحول سرخی مائل ہو گیا تھا۔ وہ تھکے مسافر کی طرح جھیل کے کنارے بیٹھ گیا تھا۔ تمناؤں کے زخم، کرب کا بوجھ اور درد کی سوغات لئے ایک بار پھر وہ سوچ کی گہرائیوں میں گم تھا۔

جب وہ اس شہر میں نیا نیا آیا تھا تلاشِ روزگار میں بھٹکتا ہوا۔ سڑکوں کی خاک چھانتا ہوا، دفتروں کے چکر لگاتا اور اپنے سرٹیفکیٹس کا بوجھ اٹھا کر سرِ شام گھر لوٹ آتا۔ نامراد و ناشاد، پھر بھی اس میں ایک امنگ تھی۔ ایک تازہ حوصلہ تھا ایک مستحکم جذبہ تھا۔ شاید اسی کے سہارے وہ ہر صبح سورج اگنے کے ساتھ پھر سے اپنی منزل کی کھوج میں نکل پڑتا۔

ان بھٹکتی ہوئی گرد آلود راہوں میں اچانک اسکی ملاقات نجمہ سے ہو گئی تھی۔ وہ دفتر میں اسٹینو کے عہدہ پر فائز تھی۔ وہ اسی دفتر میں ملازمت کی امید لیکر داخل ہوا تھا۔ شاید اسکی مایوسی نجمہ سے دیکھی نہ گئی اور ازراہ ہمدردی اس نے کچھ پوچھنا چاہا تھا۔ نجمہ نے اسے اسکے بہترین اسناد پر مبارکباد بھی دی تھی۔ مدتوں میں ملا ایک مونس سمجھ کر اس نے اس مختصر سے وقفہ میں نجمہ سے اپنی داستان غم بیان کر ڈالی تھی۔ اور شاید اسکی بے بسی کے پیش نظر اس نے اسے اپنی چھوٹی بہن فریدہ کو ٹیوٹیشن کا آفر بھی دیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ اس بہانے اسکی مدد کرنا چاہتی ہو۔ اس نے کچھ سوچ کر نجمہ کا یہ آفر قبول کر لیا تھا۔

دفتر کے بعد وہ اس شام نجمہ کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ نجمہ کے گھر کا فیشن زدہ ماحول دیکھ کر وہ قدرے متاثر ہوا۔ اس رات وہ دیر

گئے گھر لوٹا۔ نجمہ کے گھر والوں کا پیار بھرا سلوک، بذاتِ خود نجمہ کا خلوص اسکا سانولا پیکر اسکی بڑی بڑی مسحور کن آنکھیں سب کچھ اسے بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ ان میں محو ہو کر اپنا گاؤں، کھیت، کھلیان سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ اپنی سمٹی ہوئی دنیا سے نکل کر اس دنیا کی فضا اسے کچھ نرالی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ نجانے کب تک وہ نجمہ کے بارے میں سوچتا رہا۔

وقت پل پل گزرتا رہا۔ فریدہ کی ٹیوشن کے بہانے اسکی ملاقات نجمہ سے روزانہ ہوتی رہی۔ کچھ دنوں بعد اسے ایک دفتر میں اچھی سی ملازمت مل گئی تھی۔ اس نے فریدہ کی پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ نجمہ اس کی آنکھوں کے راستے دل کی گہرائی تک پہنچ گئی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد نجانے کیوں اسکو یک گونہ سکون میسر آ جاتا۔ نجمہ بھی اسے دل سے چاہنے لگی تھی۔ اسکی سادگی اور بھولا پن نجمہ کی پسند ہی نہیں بلکہ محبت کی بنیاد تھے۔ اسکی خزاں رسیدہ زندگی کا پیڑ پھر سے بار آور ہونے لگا تھا۔ نجمہ کی چاہت نے اس میں امنگوں اور تمناؤں کے پھول کھلا دیئے تھے۔ اس نے گاؤں سے اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہنوں کو اپنے پاس بلوالیا تھا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ ماں کی خدمت اسکی زندگی کا اولین مقصد تھا۔

نجمہ اسکی کائنات تھی۔ وہ اسکی محبت میں کھو چکا تھا۔ وہ دن اسکا بڑا ہی بے کیف گزرتا جس دن اسکی ملاقات نجمہ سے نہیں ہوتی۔ نجمہ اسکی دھڑکنوں میں سما چکی تھی۔ زندگی کی منڈیر پر اسنے نجانے کتنے خوابوں کے چراغ جلا رکھے تھے۔ نجمہ بھی سراپا خلوص تھی۔ جب بھی وہ اس سے ملتا وہ

انوکھی مسکراہٹوں سے اسکا خیر مقدم کرتی۔ اسکا انداز محبت انفرادی تھا۔

آخر وہ دن بھی آیا جب نجمہ اسکی ہوگئی۔ اسکی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔ جھیل کی سطح پر کتنے سنگ ریزے گرنے کی آواز آئی اور پل بھر میں پھر سکوت طاری ہوگیا۔ اسکی سوچ کا سلسلہ پھر سے قائم ہوگیا۔ شادی کیا ہے۔ یہ ایک رسم تو نہیں اس کے کرب سے کراہنے کا تاثر لگنے لگا۔

وقت کا دھارا دن ہفتہ ماہ اور سال بن کر بہتا رہا۔ نجمہ نے ایک بار نجانے کن جذبات سے مغلوب ہوکر کہا تھا۔ ''شمیم مجھے خود سے کبھی جدا مت کرنا تمہارے بغیر میں مرجاؤنگی''۔ اور اس نے فرطِ احساس سے اسے بھینچ لیا تھا۔ اس وقت ساری کائنات اس کے دامن میں سمٹ آئی تھی۔ ساری دنیا اسے حسین خواب کی مانند محسوس ہورہی تھی۔ اسے اس بات کا ہلکا سا بھی شائبہ نہ تھا کہ اسکی زندگی ان حادثات سے دوچار ہوجائیگی۔

چند ہی دنوں میں حالات نے نئی کروٹ لی۔ نجمہ کی محبت کی حرارت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ جذبات کا سیلاب اترنے لگا۔ آنکھوں سے تصورات کا کہرہ چھٹنے لگا۔ نجمہ بدل رہی تھی۔ یا وہ خود یا پھر حالات۔ اس نے محسوس کیا کہ نجمہ کو اسکی ماں اور بہنوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں ہے۔ وہ اکثر ماں کے دیہاتی اطوار کا مذاق اڑاتی۔ اس کے دل پر اک چوٹ سی لگتی۔ پھر بھی وہ خاموش رہ کر سب کچھ سہہ جاتا۔ وہ نجمہ کو محبت تو دے سکتا تھا مگر اعلیٰ سوسائٹی کا فیشن زدہ ماحول، پارٹیاں، کلب، اور رنگین محفلیں سب کچھ اسکی دسترس سے بعید تھا۔ اسکا ذہن تو گاؤں کے کچے

مکانوں، گھروندوں، کھیتوں، کھلیانوں، ندیوں، اور جھرنوں کا گہوارہ تھا۔

بات بات پر روٹھنا، ماں سے جھگڑنا نجمہ کی فطرت بن چکی تھی۔ وہ اکثر روٹھ کر میکے چلی جاتی اس وقت اسے اپنے شوہر کی پل بھو بھی فکر نہیں رہتی۔ اسکی زندگی زخم بن چکی تھی۔ اس نے نجمہ کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ زندگی کے سارے خوبصورت لمحات زخمی ہو گئے تھے۔ زندگی کی بے کیفی ایک عذاب ہی تو تھی۔ ماں ناراض ہو کر بیٹوں کے ساتھ گاؤں لوٹ گئی تھی۔ ایک بار پھر وہ اکیلا ہو گیا تھا۔ تنہا ہی کا بوجھ لئے وہ کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ مگر نجمہ۔۔ اسکی محبت نفرت میں بدل چکی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی ''شمیم تم سے شادی کر کے میں نے زندگی کی سب سے بڑی بھول کی ہے۔'' محبت کا روپ اتنا گھناؤنا اس قدر بدصورت بھی ہو سکتا ہے اسے معلوم نہ تھا۔

اور آج نجمہ کے اصرار پر... حالات سے مغلوب ہو کر.. نجانے کیوں اس نے کانپتے ہاتھوں سے طلاق کے کاغذات پر دستخط کر دیئے تھے۔ کورٹ گیٹ کے باہر اس نے دیکھا نجمہ کسی دوسرے نوجوان کی بانہوں کا سہارا لئے خراماں خراماں جا رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اسکی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

اس نے کل ہی ملازمت سے استعفیٰ دیکر اس شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یادوں کا ایک طویل قافلہ اس کے تعاقب میں تھا۔ روتی، بلکتی ہوئی بے شمار یادیں اس کے اطراف گھوم رہی تھیں۔ لہولہان یادوں اور اداس اداس تصور کو وہ آج اس جھیل میں

دفن کر دینا چاہتا تھا۔ محبت کے اس دردناک انجام پر ایک بار پھر اسکا دل بھر آیا۔ اسکی آنکھوں سے اشکوں کے موتی نکل کر جھیل کی خاموش گہرائیوں میں کھو گئے۔

آخری بار اس نے جھیل کی سطح پر مایوس نظر ڈالی۔ اس کے چہرہ پر کرب کی لکیریں اور نمایاں ہو گئیں۔ اور بوجھل قدموں سے وہ لوٹ آیا۔ شام مزید ماتمی ہو چکی تھی۔ جھیل کے دائرے اب بھی بن بن کر ٹوٹ رہے تھے۔ سمٹ رہے تھے مگر وقت کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

رِشتوں کے سراب

مورخہ ۸/ جون ۸۲ء

میری روح کی گہرائیوں میں بسے، پیارے سنّی!

تم سے بچھڑے ہوئے یوں تو ابھی چند ماہ ہی گزرے ہیں مگر لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئیں۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ مگر نجانے کیوں دل بہت اداس بہت غم رسیدہ ہے۔ اب تو دھڑکنیں بھی بار گزرنے لگی ہیں۔ سوچا تمہیں عمیق گہرائیوں سے آواز دوں اور تمہاری سالگرہ پر مبارکباد پیش کروں۔

سنّی! میں تو اب جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگی ہوں۔ تمہارا تصور میری آس ہے۔ میں اس تصور کی ایک بھی پرچھائیں اپنی نظروں سے دور نہ ہونے دونگی۔ تمہارا خیال جو شاید میری زندگی بن چکا ہے جس میں میرے ذہن کے سبھی دریچے کھو چکے ہیں۔ ہوسکتا سنی! تمہارے شب و روز کی کیفیت بھی ایسی ہی ہوگی۔ تم مجھے کتنا پیار کرتے ہو۔ تمہاری محبت نے مجھے حسین زندگی سے روشناس کرادیا ہے۔

جب بھی مجھے ہماری جدائی کی قریبی راتوں کا خیال آتا ہے ایک گرم سی شے پورے بدن میں رینگ جاتی ہے۔ وہ بھیانک رات اب بھی مجھے یاد ہے جسکی سحر میرے لئے جدائی کا پیام لیکر آئی تھی۔ تم مجھے یادوں کے سہارے چھوڑ کر کینڈا چلے گئے تھے۔ میرا تصور بھی آنسوؤں میں بھیگ گیا۔ میری زندگی بذات خود ایک آنسو بن گئی۔ دیکھو سنی! میری تحریر بھی

بھیگی بھیگی ہے۔

سنی! میں خوش نصیب ہوں جو میرے دامن میں تمہاری محبت کے پھول کھلے۔ تمہاری قربت کے وہ مہکتے لمحات جب بھی یاد کرتی ہوں دل کو یک گونا سکون ملتا ہے۔ سنی! اب لوٹ بھی آؤ! میرے بغیر کینڈا تمہیں ضرور ویران سا لگتا ہوگا۔ میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی آخر کب تک، دلاسوں، تسلیوں کے کھلونوں سے اپنے دل بہلاؤں۔ کب تک آخر... یہ دل بڑا ظالم ہے۔ مانتا ہی نہیں!!

سنی! یہ موسم بھی کمبخت بڑے جان لیوا ہوتے ہیں۔ پچھلی برسات میں ہم ایک ساتھ رہے۔ بھیگے بھیگے ماحول میں، سلگتے جذبات تمہاری یاد دلا دیتے ہیں۔ برسات کی بھیگی بھیگی راتیں، بہاروں کی مہکتی صبحیں، سرما کی خواب گیں شامیں سب کچھ مجھے ویران سی لگتی ہیں۔ ایسے میں میرے ساتھ صرف تمہاری یاد ہوتی ہے۔ تمہارا تصور ہوتا ہے۔

سنی! تمہارے بغیر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کہیں سے ٹوٹ سی گئی ہوں۔ ایسی زندگی کو بھلا کون سا عنوان دوں میں۔ یہ زندگی چند سانسوں کی رہگزر بن گئی ہے۔ کاش میں اڑ کر تمہارے پاس آجاتی اور تمہارے سینہ سے لگ کر ساری کلفتوں پر فتح پالیتی۔ تم مجھے پیار سے بھینچ لیتے اور میرے چہرہ پر بوسوں کی بوچھار کر دیتے۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے پل بھر میں مجھے جنّت مل گئی ہو۔

سنی! آج کل ہر لمحہ ارمانوں کی دنیا سنوارنے میں گزر جاتا ہے۔ اپنے آپ سے دور ہوکر کہیں کھو جانا اچھا لگتا ہے۔ نجانے تم کب آؤ گے۔ کب مجھے اپنی دلہن بنا کر میرے خوابوں کو حقیقت سے ہم کنار

کرو گے۔ زندگی کی اس منزل کا تصور ہی مجھے مسرت کی آغوش میں پہنچا دیتا ہے۔ یاد ہے سنی! تم نے جاتے وقت مجھے سینہ سے لگا کر کبھی نہ بھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وعدہ کی نحیف کشتی میں سوار ہو کر میں زندگی کے سمندر میں کہاں سے کہاں نکل گئی ہوں۔ سنی! تم میری منزل ہو۔ میری تمناؤں کی معراج میرا سب کچھ تم ہو۔ سب کچھ!!

سنی! جلد ہی لوٹ آؤ۔ مری تنہائیاں تمہیں آواز دیتی ہیں۔ یادوں کے اندھیروں میں تمناؤں کا ٹمٹاتا ہوا دیپک جلائے میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو میں یادوں کے اس ڈھیر میں دفن ہو کر رہ جاؤں۔

سنی! تم کیسے ہو۔ کینڈا کیا گئے ہم سب سے ناطہ توڑ لیا۔ ایک دو خطوط لکھ کر رسم پوری کر دی۔ کیا اس قدر مصروف ہو گئے۔ کیا تمہیں اس وقفہ میں ایک بار بھی میری یاد نہیں آئی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں جانتی ہوں تم مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہو۔ مگر محبت کے اظہار میں تکلف برتتے ہو۔

سنی! اس خط کے ساتھ تمہاری سالگرہ کی مبارک ساعت پر ایک چھوٹا سا تحفہ بھیج رہی ہوں۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد کر لینا۔ اور جلد لوٹ آنا۔

تمہاری محبت! رشمی!!!

کینڈا ۔۱۲ ارجون ۸۲ء

ڈیئر رشمی!

تمہارا خط پا کر زندگی کے کچھ بیتے پل یاد آ گئے۔ تم نے ایک خشک

پھول میری سالگرہ پر بطور تحفہ بھجوایا ہے۔ جسکے لئے میں تمہارا مشکور ہوں۔

رشمی! ہر انسان اپنی زندگی میں کچھ خواب دیکھتا ہے۔ اور خواب تو بس خواب ہی ہوتے ہیں۔ حقیقت سے بے نیاز۔ لوگ خوبصورت تتلیوں کو پکڑنے کی آرزو میں خود، خود سے دور ہو جاتے ہیں۔ یا خود کو زخمی کر بیٹھتے ہیں۔

رشمی! تم تو بہت جذباتی ہو۔ بھلا جذبات کے سہارے کب تک کوئی زندہ رہے۔ آنسو، فغاں، شکوہ، تنہائی آج کے دور میں ایک بیکار سی شے ہے۔ جذباتی لوگ رشتوں کے سراب میں کھو کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتے ہیں۔ رشتوں کے حصار میں خود کو قید کر لینا دانشمندی نہیں ہے۔ دنیاوی رشتے پیڑ کی چھاؤں کی طرح ہوتے ہین۔ جو سورج کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں اور سورج کے ڈوبتے ہی غائب ہو جاتے ہیں۔

کینڈا آکر مجھے لگا جیسے میں ایک پنجرہ سے نکل کر کھلی فضاؤں میں آ گیا ہوں، یہاں مجھے زندگی کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ زندگی ایک نعمت ہے۔ یہ احساس مجھے سیمؔا کے توسط سے میسر ہوا۔

رشمؔی میں انڈیا آ رہا ہوں۔ تم سے ملنے۔ سنڈے لاسٹ فلائٹ سے اور سنو! تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرے ساتھ میری شریکِ زندگی سیما بھی آ رہی ہے۔ سیمؔا میری سالگرہ کا سب سے حسین تحفہ بن کر میری زندگی میں پچھلے چار دن پہلے ہی آئی ہے۔

تمہارا دوست! سنّیؔ!!!

☆☆☆
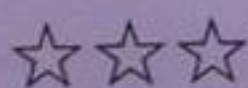
موسم گیتوں کا

بم کے دھماکوں سے فضا مسموم ہو چکی تھی۔ رہ رہ کر بندوقوں کے چلنے کی آواز سے ماحول پر لرزہ طاری تھا۔ سارا شہر خوف و ہیبت کے کہرہ میں لپٹا ہوا تھا۔ زخموں سے تڑپتے ہوئے لوگوں کی دردناک صدائیں اور بچوں کے بلکنے کی دلدوز چیخ و پکار سے آسمان بھی تھرا اٹھا تھا۔ وہ شہر جو کبھی امن و آشتی کا گہوارہ کہلاتا تھا وہاں آج صبح سے ہی قیامت صغریٰ کا منظر نظر آ رہا تھا۔ وہ شام کس قدر اداس تھی۔ آبادی سے دور جنگل کی خاموش فضاؤں میں ایک سوکھے پیڑ پر دو بوڑھے پنچھی بڑی دیر سے کسی سنجیدہ گفتگو میں محو تھے۔ دھماکوں کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔ فضا میں بکھرا ہوا دھواں شام کے ماتھے پر کلنک کی طرح ابھر رہا تھا۔

بوڑھا پنچھی اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا ''شہر سلگ رہا ہے۔ مکان جل رہے ہیں معصوم بچے بلک رہے ہیں۔ پولس کی گولیاں لوگوں کے سینے چھلنی کر رہی ہیں۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں لاشوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ سڑی گلی لاشوں کو کوئی اٹھانے والا نہیں۔ تعفن سے ہوائیں تک پراگندہ ہو چکی ہیں۔ میں ابھی ابھی یہ منظر دیکھ کر امن کے اس گہوارے سے لوٹا ہوں۔ میری آنکھیں یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکیں۔''

دوسرے پنچھی نے سرد آہ بھری۔ اور کہا ''وہ دن بھی کیا دن تھے جب بھارت میں آزادی کی جدوجہد جاری تھی۔ لوگ اپنے وطن کو آزاد کرانے کا جذبہ لئے گھروں سے نکل پڑتے تھے۔ اس وقت رنگ و نسل،

مذہب وملت، مسجد ومندر کا امتیاز کیئے بغیر شانہ بشانہ حصول آزادی کا مقصد لئے چلتے تھے۔ اس وقت سب کا ایک جذبہ ایک خواب ہوا کرتا تھا۔ بس آزادی۔ جب ہندوستان آزاد ہوا ایک ساتھ کئی آوازیں اٹھیں ہندوستان ہمارا ہے۔ اس وقت میں بہت چھوٹا سا تھا۔ یہ پیڑ بھی خاصا گھنا تھا۔ اسی پر بیٹھ کر میں دیکھتا اور سوچتا تھا۔ اسی شہر کی مسجدوں سے جب مؤذن کی دلنواز آواز فضاؤں میں رینگتی ہوئی دور دور تک چلی جاتی اس وقت شبنم پھولوں کا منھ دھلاتی تھی۔ صبح رات کی تاریکیوں سے نکل کر سورج کا استقبال کرتی تھی۔ کوئل کی کوک اور پرندوں کی چہکار سے فضائیں گونج اٹھتی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اپنے دامن میں رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو سمیٹ کر سارے ماحول کو عطر دبیز میں ڈبو کر رکھ دیتی تھیں۔ لوگ اپنے بچوں کے ساتھ ناچتے گاتے گنگناتے یہاں تک آجاتے تھے۔ جب دن شام کی بانہوں میں سماجاتا اس وقت مغرب سے شفق نمودار ہوتی تھی۔ سرخ سرخ عارض والی شفق۔ دور مندروں کی گھنٹیوں کی صدا فضا کے ایوانوں میں ایک عجیب قسم کی نغمگی بکھیر دیتی تھی۔ اور ماحول کا چپہ چپہ رنگینیوں میں کھو جاتا تھا۔ کیسے لمحے تھے وہ کیسا وقت تھا وہ! کیسا تھا وہ ہندوستان۔ ہمارا اپنا پیارا پیارا ہندوستان۔

یہ سنکر پہلا پنچھی آبدیدہ ہوگیا۔ اسکی بوڑھی تجربہ کار آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی۔ کہنے لگا میں اس شہر کو ہندوستان تصور کرتا ہوں۔ آج میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں کاش اسے دیکھنے سے پہلے میری آنکھیں بند ہوجاتیں۔ آج کا انسان شیطان سے بدتر ہوگیا ہے۔ وہ اپنے ہی بھائیوں کے خون کا پیاسا اپنی ہی اولاد کا دشمن ہوگیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ خود کو مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ یہ انسان

جسکی عظمت کی خاطر ایک فرشتہ شیطان بنا دیا گیا۔ یہ انسان جسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا گیا تھا اتنا گر جائیگا میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ ابھی ابھی میں نے دیکھا کہ وہ کس سفا کی سے ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہا تھا۔ مکانوں میں آگ لگا رہا تھا۔ دوسروں کو برباد کرنے میں مصروف یہ انسان اپنے مستقبل سے بے خبر اپنے انجام سے بے پرواہ۔ اسکا مقصد صرف بہاروں کو خزاں کا لباس پہنانا۔ آبادیوں کو ویرانیوں میں بدلنا خوشیوں کا صفایا کر کے درد اور تکالیف کے کانٹے بکھیرنا اور دوسروں کو محض اپنی تفریح کی خاطر ستانا۔ یہ سفاک اور سرکش انسان حیوانوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ اسکی وحشیانہ حرکات سے اس جنگل کے درندے بھی شرمسار ہو گئے ہونگے۔

اتنا سنکر دوسرا پنچھی بھی آہیں بھرنے لگا۔ اپنی سوچ کی لے سے ابھر کر وہ گویا ہوا۔ کتنا پیارا تھا وہ ہندوستان جہاں ہر لمحہ امن کی بنسی بجتی تھی۔ دوسروں کی سیوا لوگوں کا شیوہ تھا۔ رات گئے تک دادی اماں بچوں کو چاند کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ماں کی لوری سنتے ہی نیند کی پریاں دیس بدیس سے سپنوں کی سوغات لیکر چپکے سے چلی آتی تھیں۔ زندگی کتنی حسین لگی تھی۔ ملک کے لوگ رنگ برنگے پھولوں سے سجے گلدستے کی طرح رہتے تھے۔ یہاں کی سیاست بے لاگ اور صاف ستھری تھی۔ لوگوں کے دلوں میں قومیت کا بے لوث جذبہ تھا۔ وہ شیر و شکر کی طرح گھلے ملے رہتے تھے۔

پہلے پنچھی نے بات کاٹ کر کہا مگر آج کا ہندوستان دنیا کے نقشہ پر ایک بدنما داغ بن کر ابھرا ہے۔ اسکی بوڑھی آنکھوں سے کڑواہٹ کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ اسکا ایک ایک لفظ نفرت کے زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ کہنے لگا۔ آج کا بھارت مندر مسجد کی گندی سیاست کے شکنجے میں

جکڑا ہوا ہے۔ آج لوگ ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہے ہیں جہاں انسانیت کا سرِ عام قتل ہو رہا ہے۔ بربریت کا بول بالا ہے۔ ایک دوسرے کو بدگمان کر کے مسائل پیدا کئے جا رہے ہیں۔ راہبر راہزن بن چکے ہیں۔ یہ نفسا نفسی اور کشا کش کا عالم ایک پُر ہول طوفان کی نشاندہی کر رہا ہے۔ لوگ مذہب و ملّت کا امتیاز تو کر رہے ہیں مگر مذہب کی تعلیمات اور نصب العین کی جانب کسی کی نظر نہیں۔ امن و آشتی کا دامن داغدار کیا جا رہا ہے۔ مندر و مسجد کو ناپاک کیا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ ملک کے آئین کو بھی طاق میں رکھ دیا گیا ہے ۔ چہرہ پر نئے نئے مکھڑے لگا کر لوگوں کو بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ زندگی کا چہرہ مسخ ہو چکا ہے۔ مہنگائی، بیروزگاری، بدامنی ،لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ، بے ایمانی سارے ہندوستان کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔ آزادی کے ان ۶۰ سالوں میں ہمارا بھارت برسوں کا بیمار نظر آتا ہے۔ ہم نے کیا کھویا کیا پایا۔ سب ہمارے سامنے ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر ہم آزاد نہ ہوئے ہوتے۔ آزادی تو ملی ہے ان شیطان صفت درندوں کو جنہوں نے معصوم لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔

دوسرے پنچھی نے دلاسہ دیا۔ بھائی ! امید رکھو! گیتوں کا موسم ضرور آئیگا۔ یہ کالے بادل ضرور چھٹ جائینگے۔ امن و آشتی کا سورج ضرور چمکے گا۔ انسانیت کا شجر ضرور بار آور ہوگا۔

اتنا کہہ کر وہ رخصت ہوگیا۔

رات کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔

اب بھی کبھی کبھار گولی چلنے کی آواز آجاتی۔ اور ماحول پھر خاموشی کے سمندر میں کھو جاتا۔ گہری خاموشی ماتمی خاموشی۔!! ☆☆☆

دھندلے عکس

عاصم ! آج اداس اداس مضمحل سا دفتر آیا تھا۔ اسکی شکن آلود جبیں اور بکھرے بکھرے بال اس کے کرب کی شہادت دے رہے تھے۔ اسکا موڈ پچھلے کئی روز سے کچھ بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ آج اسکی بجھی بجھی آنکھیں شب بیداری کی چغلی کھا رہی تھیں۔ آج اسکا وجود بڑا ہی ویران سا لگ رہا تھا۔ اجڑا اجڑا... ٹوٹا ٹوٹا۔

میز پر سر جھکائے وہ فائلوں میں کھویا ہوا تھا۔ آج اسے دفتر کی فائنل رپورٹ کے اسٹیٹمنٹ تیار کرنے تھے۔ مگر کام میں اسکا من بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر وہ شبنم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شبنم جو اسکی شریک زندگی، رفیقہ حیات سب کچھ تھی۔ روز کی طرح آج بھی وہ اس سے جھگڑ کر دفتر آیا تھا۔ روز کے ان جھگڑوں، بحثوں اور طنزیہ فقروں سے وہ تنگ آ گیا تھا۔ اتنی بے کیف ہو جائے گی یہ زندگی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ زندگی کی اس بے کیفی کے لئے شبنم ہی اسکی نظر میں موردِ الزام تھی۔ اور شبنم تھی کہ اسے ہی قصوروار ٹھہرانے پر مصر تھی۔

دو سال پہلے ہی انکی شادی ہوئی تھی۔ شبنم لجائی شرمائی جب اسکی زندگی میں آئی تھی اس وقت اس کے شب و روز کس قدر حسین ہو گئے تھے۔ وہ ہر لمحہ شبنم کے خیالوں میں کھو کر اس کے حسن کی خشبو میں محو ہو کر گزار دیتا تھا۔ دفتر کے ساتھی اکثر اسے خیالوں میں کھویا کھویا دیکھ کر چھیڑتے تھے۔ دفتر آتے وقت شبنم روزانہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آتی

اور وہ اسکی حسین مسکراہٹ کا تصور لئے دفتر چلا آتا شام جلد دفتر سے لوٹتا بس یہی اسکا معمول بن گیا تھا۔ایک شبنم کے آنے سے وہ ساری دنیا سے دور ہو گیا تھا۔ دوستوں کی محفلوں سے دور، یوتھ کلب کی سرگرمیوں سے پرے۔اپنی شبنم کے قرب میں کھویا کتنی پر کیف زندگی گزار رہا تھا وہ۔

وقت کے ساتھ دنیا کی ہر شے بدل جاتی ہے۔سوچنے کا انداز تک تبدیل ہو جاتا ہے۔ جذبات کا غبار جب چھٹ جاتا ہے اس وقت اطراف کا ماحول نیا نیا سا لگتا ہے۔ٹھیک اسی طرح اس کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔شبنم کی محبت ایک نیا روپ لے رہی تھی۔ دنیا داری میں محو ہو کر دونوں کے جینے کے انداز بدل رہے تھے۔اکثر آپس میں تکرار ہونے لگی تھی۔ بات بات پر یہ بحث جھگڑے کی شکل اختیار کر جاتی۔دونوں بات بات پر احساس برتری جتاتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کرتے۔

کئی کئی دن ایسے بے رنگ ماحول میں ایک دوسرے سے بغیر کسی گفتگو کے گزر جاتے۔ایسا لگتا دونوں کسی ڈرامہ کے کردار ہیں جو اپنا اپنا رول کر گزرنے کے بعد جدا ہو گئے ہیں۔ پھر اسکے بعد خاموشی مسلسل خاموشی۔

پچھلے چار دنوں سے گھر میں اسی طرح کا ماحول بنا ہوا تھا۔شبنم کو اس سے شکایت تھی کہ عاصم اس سے بیزار ہو گیا ہے۔اسے اپنے گھر سے رغبت نہ رہی۔ وہ بار بار پڑوس میں آئے نئے پڑوسی حسین صاحب کی بیوی شمیم کا ذکر کرتی۔شبنم کی زبانی حسین صاحب کے گھر کا رکھ رکھاؤ، فرنیچر، رہن سہن کی تعریف سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے۔اس پر

احساس کمتری غالب آنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ شبنم کے خواب کس قدر قیمتی ہیں۔ اسکی دسترس سے بعید۔ اس خیال سے وہ مایوس ہو گیا تھا۔

آج بھی جیسے تیسے اس نے کھانا زہر مار کیا۔ شبنم نے کھانا لگا دیا تھا خود دانستہ کچن میں چلی آئی تھی۔ وہ اکیلا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا کھانے کی رسم پوری کرتا رہا۔ اور بوجھل قدموں سے دفتر چلا آیا تھا۔

گھر کے اس بے لطف ماحول، شبنم کی سرد مہری سے وہ اکتا گیا تھا۔ اسکی سوچ سلب ہو چکی تھی۔ کبھی وہ زندگی کو موج و مستی کا نام دیا کرتا تھا۔ اسے کالج کے وہ دن یاد آرہے تھے جب وہ کالج کا پرنس ہوا کرتا تھا۔ کئی لڑکیاں راہوں میں آنکھیں بچھائے اسکا انتظار کیا کرتی تھیں۔ اور وہ انھیں نظر انداز کر کے گزر جایا کرتا تھا۔ ناہید، صبیحہ، ریحانہ جو اسے دیکھ کر آہیں بھرتی تھیں۔

اس خیال کے آتے ہی وہ کراہ اُٹھا۔ ازراہِ انتقام شام کو دفتر سے گھر کی بجائے اس نے یوتھ کلب جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی زندگی کی ویرانیوں سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ شبنم کے تصور سے بھی اسے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ وہ اس وقت ناہید، صبیحہ اور ریحانہ کی رعنائیوں میں کھو جانا چاہتا تھا۔ جنکی محبت اور چاہت کو ایک بار اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ دوبارہ اسے حاصل کرنے کے لئے بیقرار ہو اٹھا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت، ایک نرالا عزم لئے وہ شہر کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

کلب کے ین گیٹ پر ہی ناہید اسے مل گئی۔ پہلے تو ناہید نے اسے نظر انداز کرنا چاہا۔ مگر اس کے تخاطب پر ناہید کو رکنا ہی پڑا۔ رسماً ہیلو کہہ کر اس نے اسے وِش کیا۔ وہ ناہید کے سامنے اپنی زندگی رکھ کر آج

سب کچھ کہہ دینا چاہتا تھا۔ وہ اس میں کھو کر اپنی بے رنگ کائنات میں رنگ بھر دینا چاہتا تھا۔ مگر رسمی گفتگو کے بعد ناہید نے بہانہ بنا کر اس سے رخصت لے لی۔ ایسا لگا گویا وہ بور ہو کر اجازت طلب کر رہی ہے۔ یا اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ ناہید کی اس بے اعتنائی پر اس کے جذبات مجروح ہو گئے۔ اسکی تمنا کے تمام محل مسمار ہو گئے۔

دفعتاً لان میں اسے صبیحہ اور ریحانہ نظر آئیں۔ وہ سرعت سے انکے قریب پہنچا۔ سرد سرد سے رسی انداز میں انھوں نے اسکا خیر مقدم کیا۔ اسکی خیریت دریافت کی اور قہقہے لگاتی ہوئی وہ بھی رخصت ہو گئیں۔ ان کی خشک آنکھوں میں اسے دور دور تک محبت و خلوص کا ہلکا سا شائبہ تک نظر نہیں آیا۔ وہ ٹوٹ چکا تھا۔ بکھر چکا تھا۔ اسکی ساری امیدیں غلط ثابت ہو چکی تھیں۔

تنہا تنہا لان کے ایک سرے پر دیر تک وہ کھڑا رہا اس کے سوچ کی لہریں تیزی سے ابھرنے لگیں۔ یہاں اسے خود بڑے قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اپنا وجود اسے فضا میں معلق غبار کی طرح نظر آ رہا تھا۔ زندگی کے آئینہ میں اپنا دھندلا دھندلا عکس دیکھ کر اسے خود سے نفرت ہونے لگی۔ اپنا محاسبہ کرنے پر وہ حمیدؔ کی نظر میں مجرم تھا۔ اسے رہ رہ کر شبنم یاد آ رہی تھی۔ نجانے وہ کس جذبہ کے تحت مسلسل تفکرات بھنور میں غوطہ زن تھا۔ شبنم اسکی رفیقۂ حیات ہے۔ اس کے بغیر تو اسکا وجود ہی ادھورا ہے۔ وہ لاکھ تنک مزاج سہی مگر ہے تو اسکی اپنی ہی۔ اسکی محبت کی پیاسی۔ جس نے اپنی ساری زندگی اپنے عاصم کے نام کر دی تھی۔

کلب کی رنگینیوں کو چھوڑ کر وہ ایک بار پھر شہر کی بھیڑ میں آ گیا

تھا۔ شبنم کا تصور اسے اب ایک من چاہی لذت بخش رہا تھا۔ اس کے من کا سارا بوجھ اب ہلکا ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا اس میں ایک نئی توانائی ایک عجیب سا ولولہ جاگ گیا ہو۔

رات کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ وہ تیز قدموں سے اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ اس وقت اس کے ہاتھوں میں شبنم کی پسند کے کپڑے، گہنے اور مٹھائیاں تھیں۔ اسکی آنکھوں یں ایک عجیب سی چمک تھی۔ اس نے دیکھا گھر کے دروازے پر بہت اداس، کھوئی کھوئی سی، بدحواس آنکھوں میں آنسو لئے شبنم تنہا اسکے انتظار میں کھڑی ہے۔!!

☆☆☆

کرب کی لکیریں

چھوٹی بڑی، نیلی پیلی، سفید سادی خوبصورت غرض ہر قسم کی خالی بوتلوں کی چھوٹی سی دوکان سجائے وہ چوراہے کے قریب فٹ پاتھ پر ایک عرصہ سے نظر آرہا تھا۔ میں قریب کی شو کمپنی میں بیٹھا اکثر اسے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی وہ مجھے شیکسپیئر کا کوئی کردار نظر آتا۔ کبھی مغلیہ پینٹنگ کا کوئی نایاب نمونہ اور کبھی کبھی کسی درگاہ کا خاموش دوزانو بیٹھا مجاور نظر آتا۔ شہر کی گہما گہمی سے بے نیاز اور چھوٹی سی دنیا میں کھویا ہوا وہ کچھ عجیب سی ہیت کا انسان تھا۔

خالی بوتلوں کی طرح اسکا جسم بھی خالی تھا۔ نحیف جسم جو عمر کے بوجھ سے قدرے خمیدہ ہو گیا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال چاندی ہو گئے تھے۔ دنیا دیکھتے دیکھتے اسکی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ لگائے وہ دن بھر سڑک کی بھیڑ کو دیکھتا رہتا تھا۔ اسکا چہرہ جھریوں سے پُر تھا۔ اسکے چاروں طرف خالی بوتلیں اس طرح رکھی تھیں جیسے رات کے وقت مرغی اپنے پروں میں بچوں کو چھپا لیتی ہے۔ سر پر بوسیدہ سی چھتری کا سایہ کئے وہ دن بھر دھوپ کی شدت، سڑک کی گرد اور اپنے چند گنے چنے گاہکوں سے الجھتا رہتا۔ میں نے اکثر اسے خاموش، تنہا تنہا کسی سوچ میں غرق ہی پایا۔ زندگی کا طویل سفر طے کر لینے کے باوجود بھی ایسا لگتا تھا وہ مطمئن نہیں ہے۔ سوائے لق دق غم کے صحرا کے اسکی زندگی میں مسرت کا کوئی نخلستان نہ تھا۔

جب شام کا دھندلکا چھانے لگتا وہ اپنی بوتلوں کی کائینات کو سمیٹ کر

اپنے پھٹے پرانے پیرہن کو جھاڑ کر چہرہ سے دن بھر کی دھول کو پونچھتا ہوا تھکے تھکے قدموں سے سامنے کی گلی میں روپوش ہو جاتا۔ اس وقت اسے دنیا و مافیہا سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ میں نے سدا ہی اس کے ہونٹ مسکراہٹ ناآشنا پائے۔ اسے کسی سے بات کرتے ہوئے انتہائی کم سخن پایا۔ عموماً اس کے جوابات نفی میں ہوا کرتے تھے۔ کئی بار میں نے سوچا آخر زندگی نے اسے اتنی بڑی سزا کیوں دی۔ یہ کیسی مجبوری ہے جو اسے جینے پر مصر رکھ رہی ہے۔ اتنی چھوٹی سی دوکان اور زندگی کے جان لیوا مصارف، طویل مسافت اور یہ زادِ راہ۔ تھکن کے باوجود بھی وہ ہر صبح پھر سے تازہ دم ہو کر اپنے مخصوص مقام پر خالی بوتلوں کی دوکان سجائے نظر آتا۔ چاہتے ہوئے بھی میں اس سے کچھ نہ پوچھ سکا۔ مجھے اس کے لبوں پر ثبت خموشی کی مہر سے چڑ سی ہو گئی تھی۔

ایک شام میں نے دیکھا کہ وہ حسب معمول اپنی دوکان سمیٹ رہا تھا۔ اسکا وجود آج کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اضمحلال کی پرچھائیاں اس کے جسم سے نمایاں تھیں۔ وہ ٹوٹ چکا تھا۔ بکھرنا ہی چاہتا تھا۔ شاید آج کوئی خاص کمائی نہ ہو سکی تھی۔ اس نے اپنی جیب میں پڑے چند سکّوں کو ایک مرتبہ پھر جنبش دی۔ وہ اشکبار ہو گیا تھا۔ اسکی چشمہ کے پیچھے سے جھانکتی آنکھوں میں ایک عجیب سے جذبے کا تاثر نظر آیا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس نے ایک جھٹکے سے بوتلوں کی ٹوکری اٹھائی اور سڑک کی بھیڑ کو چیرتا ہوا سامنے کی گلی میں روپوش ہو گیا۔ میری نگاہیں اس موڑ سے لوٹ آئیں۔ اس کے بعد کئی دنوں تک وہ نظر نہیں آیا۔

شہر کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مگر نجانے وہ کیوں رہ رہ کر

مجھے یاد آ رہا تھا۔ فٹ پاتھ کے اس خالی حصہ کو دیکھ کر میرے ذہن میں اس شام کی یاد تازہ ہو جاتی جب وہ مضمحل سا مایوس ہو کر چلا تھا۔ طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں گھر کرنے لگے ۔ کہیں وہ بوڑھا زندگی کا بوجھ ڈھوتے ڈھوتے ...... نہیں، نہیں !! ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے وہ علیل ہو ۔ کبھی کبھی تو میں بڑی دیر تک زندگی کی کتاب کے اس کردار کے بارے میں سوچتا رہتا۔

کئی دن یونہیں گزر گئے ۔ ایک شام غیر اختیاری جذبہ کے تحت میرے قدم اس گلی کی جانب مڑ گئے جہاں وہ ہر شام کھو جایا کرتا تھا۔ میری نظریں تو ہر بار گلی کے موڑ تک اسے چھوڑ کر واپس لوٹ آتی تھیں ۔ وہ کہاں رہتا ہے، کہاں جاتا ہے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں نے دیکھا ایک مکان کے صحن میں لوگوں کی بھیڑ جمع ہے ۔ کافی چہل پہل ہے ۔ قریب پہنچنے پر یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت زدہ رہ گئیں کہ وہی بوڑھا انتہائی نفیس لباس زیب تن کئے مسند پر بیٹھا ہے ۔ اس کے اطراف لوگوں کا جمگھٹ تھا۔ اس کے چہرہ پر کرب کی ہلکی سی لکیر تک نہ تھی ۔ وہ چہرہ جو درد سے تعبیر تھا اب آسودگی کا گہوارہ نظر آتا تھا۔

اس کے اطراف اب بھی بوتلیں بکھری پڑی تھیں ۔ شاید بوتلوں سے اسے بڑی محبت تھی ۔ میں نے اس کی طرف بہ نظرِ غائر توجہ کی ۔ وہ اب بھی اپنے اطراف کئی قسم کی بوتلیں سجائے دوزانو بیٹھا تھا۔ مگر فرق اتنا تھا کہ یہ بوتلیں خالی نہیں تھیں ۔ ان میں کئی قسم کی شراب بھر کر لیبلوں سے مزین کر دیا گیا تھا۔ اور لوگ تھے کہ بوتلوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے مطالبات کا ایک بے ہنگم شور اس کے اطراف برپا تھا۔ ☆☆☆

اُجالے سے اندھیرے تک

وقت کا دھارا بہہ رہا تھا۔ ایک اک لمحہ قطرہ قطرہ بن کر رواں دواں تھا۔ شہنائیاں بج رہی تھیں۔ چاروں طرف اس کے چاہنے والوں کی بھیڑ تھی۔ دور دور تک اس کے شائقین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ شہر کی تمام سڑکیں صاف ستھری دکھائی دے رہی تھیں۔ تمام شاہراہوں پر کاغذ کے خوبصورت گیٹ بنائے گئے تھے۔ جگہ جگہ اس کی آمد کے اشتہار آویزاں تھے۔ راستوں کو رنگین قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ آج انکا چہیتا نیتا آنے والا تھا۔

اس کی کار کے اطراف کئی اور کاریں تھیں۔ آگے پیچھے ہجوم تھا۔ ہر شخص بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے کا متمنی تھا۔ شہر کی شاہ راہ سے اسکا جلوس ہوکر ایک خوبصورت پارک کے قریب رک گیا۔ شہنائیوں کی صدائیں تیز تر ہوگئیں۔ شہر کا یہ سب سے خوبصورت پارک تھا۔ اس میں ڈاکٹر رونددر ناتھ ٹیگور کی مورت نصب ہونے والی تھی۔ سنگ بنیاد کی رسم اسی کے ہاتھوں ادا ہونی تھی۔

بے شمار تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے بیچ سنگ بنیاد کی رسم ادا کی گئی۔ کئی فوٹوگرافروں نے اس لمحہ کو اپنے اپنے کیمروں میں قید کرلیا تھا۔ سارا شہر پارک اور اس کے اطراف اُمڈ آیا تھا۔ دھواں دھار تقاریر کے دوران اسکی ثنا خوانی میں سیاسی مقررین نے زمین آسمان کے قلابے ملادیئے۔

ایک مرتبہ پھر شہنائیوں کی آواز تیز ہوگئی۔ تالیوں کی صدا سے اسکی آنکھ کھل گئی۔ اپنے اقتدار کا زمانہ اسکی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ اسکی ویران آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ چہرہ پر کرب کی سطور ابھر آئی تھیں۔ وہ آج اسی پارک میں بھوکا پیاسا تنہا ٹیگور کے بیجان مجسمہ سے ٹیک لگائے لیٹا تھا۔ وہاں نہ شہنائیاں تھیں نہ تالیوں کی گونج۔ چاروں طرف ویرانی اور وحشت کا سا ماحول تھا۔ ان چند برسوں میں جانے کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ وہ خود سے ہی اجنبی ہوگیا تھا۔

ایک بار پھر اس نے سنگ بنیاد پر کندہ تحریر پڑھی۔ آنسوؤں کے چند بے رنگ قطرے اس پتھر پر چھوڑ وہ شہر کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔

اس کے اجالے سے لیکر اندھیرے تک سفر کے بعد بھی وقت کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وقت کا دھارا اب بھی محوِ خرام تھا۔

☆☆☆
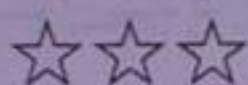
خوابِ شکستہ

آج علی الصبح ہی عاشو نے مجھے جگا دیا تھا۔ رات کا تیسرا پہر بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں گزر گیا تھا۔ بستر پر پڑا دیر تک میں نجانے کیا کیا سوچتا رہا۔ صبح سے کچھ دیر پہلے ہی میری آنکھ لگی تھی۔ عاشو نے بڑے پیار سے مجھے جگایا تھا۔ کتنا خوش تھا وہ۔ اس کے چہرہ پر تمناؤں کی قوسِ قزح ابھر آئی تھی۔ شاید رات بھر اسے بھی نیند نہیں آئی تھی۔ عاشو کی خوشی میری حیات کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ ثمینہ کے گزر جانے کے بعد عاشو کے لئے ماں باپ، بھائی بہن دوست سبھی کچھ میں ہوں۔ دو سال کا روتا بلکتا ہوا عاشو میرے سینہ سے لگ کر آج چوبیس سال کا خوبرو نوجوان بن چکا ہے۔ عاشو میرے زخموں کا مرہم زندگی کی مہیب تاریکیوں میں میری امیدوں کا ٹمٹماتا چراغ ہے۔ ثمینہ کی وفات کے بعد میں زندگی سے ناامید ہو گیا۔ عاشو ہی تھا جس نے مجھے جینے کے لئے مجبور کیا۔ وہ میری سانسوں سے بندھی زنجیر ہے۔ جس سے میرے شب و روز میں ایک خاص ارتعاش رہتا ہے۔

عاشو نے پچھلے ماہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ٹاپ کر کے میری پوزیشن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس وقت میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ فرطِ مسرت سے مغلوب ہو کر میں نے اسے من پسند تحفہ مانگنے کے لئے کہا تھا۔ اور اس نے بغیر کسی جھجک کے سعدیہ کی فرمائش کر دی تھی۔ عاشو کی یہ بے تکلفی مجھے کچھ عجیب سی لگی تھی۔ اسکا معصوم چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اسکی آنکھوں میں تمناؤں کے کئی خواب انگڑائیاں لے رہے تھے۔ میں نے

سعدیہ کے بارے میں تفصیل چاہی ۔ تب عاشو نے بتایا سعدیہ اسکی کلاس فیلو ہے اور لکھنؤ کے نامی انجینئر اشفاق احمد کی اکلوتی بیٹی ہے۔ لکھنؤ کا ذکر آتے ہی میرے اعصاب پر بجلی گر پڑی ۔ مگر بیٹے کے جذبات کا احساس کر کے چپ چاپ سب کچھ سنتا رہا۔ عاشو سعدیہ کے ذکر میں کھوسا گیا۔ اس نے سعدیہ کی تعریف میں کائنات کے سبھی رنگوں کو مات دیدی ۔ گھنٹوں اس نے اس کے حسین سراپے کی تعریف کی تھی ۔ اس کے جذبوں کے عکس میں مجھے اپنا عہدِ شباب نظر آنے لگا تھا۔ ماضی کی بے شمار یادیں ذہن کے قرطاس پر ابھرنے لگی تھیں ۔ میں مبہوت سا عاشو کی ساری باتیں سنتا رہا۔ اسکی ضد تھی کہ میں لکھنؤ جا کر اشفاق صاحب سے اپنے عاشو کے لئے سعدیہ کا ہاتھ مانگ لوں ۔ مگر.... لکھنؤ کا نام سنتے ہی مجھے اپنا وجود افق پر ڈولتے ہوئے تارے کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ لکھنؤ سے میرا جذباتی رشتہ تھا۔ جس نے میرے درد کو حیات بخشی تھی ۔ یں یہاں سے غم کی ایک ایسی سوغات لیکر لوٹا تھا جسکا کرب لمحہ لمحہ میری روح کو ڈستا رہا۔ لکھنؤ سے لوٹے ہوئے تقریباً پچیس برس گزر گئے تھے ۔ میں دوبارہ اس شہر میں کبھی نہ آنے کا قصد کر کے لوٹا تھا۔ یہ کیسی کشمکش، کیسی مجبوری تھی کیسا تذبذب تھا۔ ایک طرف عاشو کی خوشیاں تھیں دوسری طرف میرے جذبات کا سیلاب ۔ آخر جیت عاشو کی ہی ہوئی ۔ اسے اشفاق احمد کو میری آمد کا ٹیلی گرام کر دینے کا کہہ کر میں اپنی خواب گاہ میں چلا آیا تھا۔ اس وقت عاشو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اسکی پیشانی پر ماہتاب ابھر آیا تھا۔

ٹرین پلیٹ فارم پر آ چکی تھی ۔ عاشو مجھے چھوڑنے پلیٹ فارم تک آیا تھا۔ میں اپنی برتھ پر نجانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ عاشو کھڑکی

سے لگا ایک بزرگ کی طرح نجانے کیا کیا مجھے سمجھا تا رہا۔ ٹرین روانہ ہوئی۔ مجھ سے جدا ہوتے وقت عاشو کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں اپنے بیٹے کی زندگی مانگنے جارہا تھا۔ اشفاق صاحب سے مل کر کیا بات کرونگا۔ کیسے اپنا مقصد انکے سامنے رکھونگا۔ میرے ذہن میں اسکا کوئی خاکہ نہ تھا۔ بس ایک عجیب سی الجھن میرے دماغ پر مسلط تھی۔ دورتک عاشو ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آتا رہا پھر اسکا وجود ایک نقطہ میں تبدیل ہوکر آنکھ سے اوجھل ہوگیا۔

ٹرین اپنی رفتار سے چلتی رہی۔ اور میرا ذہن ماضی کے سمن زاروں میں گشت کرتا رہا۔ پچیس برس کا طویل عرصہ سمٹ کر تصور میں گردش کرنے لگا۔ کسی یادگار کہانی کی طرح۔ ماضی کے صفحہ پر ابھری کہانی .... میری اپنی زندگی کی کہانی پل پل برف کی طرح گھلنے لگی۔ خیالات کا قافلہ مجھے ماضی کے لکھنؤ میں لے آیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب میں ملازمت کی تلاش میں لکھنؤ کی سڑکوں کی خاک چھانتا پھرتا۔ پھر بھی مجھ میں ایک جوش تھا ولولہ تھا۔ اسی اثناء میرے ایک دوست نے میری ملاقات شعیب الرحمن اعظمی سے کروائی۔ جو کسی محکمہ میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر تھے۔ انھوں نے میری ہمت بندھائی۔ ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ مجھ سے کافی متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہمیں شام گھر پر چائے کے لئے مدعو کرلیا۔

اعظمی صاحب فطرتاً بڑے بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ انکی سلجھی ہوئی ذہنیت نے ان کی شخصیت کو اور بھی پروقار بنادیا تھا۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی نوشابہ مقامی پرائمری اسکول میں معلّمہ تھی۔ اس سے چھوٹی نادرہ میٹرک میں زیرِ تعلیم تھی۔ اور سب سے چھوٹی

نسیمہ پرائمری اسکول کی کسی جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ اعظمی صاحب نے اپنی سبھی بیٹیوں سے میرا تعارف کرایا۔ نادرہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ وہ سائنس کی طالبہ تھی۔ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سدا مسکراتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان آنکھوں میں عنوان شباب کے خواب اور تمناؤں کا ایک جہاں آباد تھا۔

امتحانات کا زمانہ تھا۔ اسکولوں میں پڑھائی کا عجیب عالم تھا۔ نادرہ بہت پریشان تھی۔ میں بھی سائنس کا طالب علم رہ چکا تھا۔ دوران گفتگو نادرہ نے بڑی اپنائیت سے مجھ سے فزکس اور کیمسٹری میں تھوڑی مدد کی التجاء کی اور میں اسکی اس درخواست کو مسترد نہ کر سکا۔ اس طرح نادرہ کی کوچنگ کے بہانے میں اعظمی صاحب کے گھر روزانہ جاتا آتا رہا۔ رفتہ رفتہ میری حیثیت ان کے گھر میں ایک فیملی ممبر کی سی ہوگئی۔

نادرہ امتحان میں اول نمبر کامیاب ہوگئی۔ اپنی اس کامیابی کے لئے اس کریڈٹ کا حقدار اس نے مجھے ہی ٹھہرایا۔ نادرہ اس دن فرط جذبات سے مغلوب ہوکر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ جذبات کی سرشاریوں میں ڈوب کر اس نے جو بھی حرکتیں کی تھیں۔ وہ فطری تھیں۔ وہ چاہ کر بھی اپنے دل کی پوشیدہ کیفیات کو چھپا نہ سکی۔ میں نے محسوس کیا تھا وہ بار بار میری طرف عجب محویت سے دیکھ رہی ہے۔ اسکی دراز پلکوں پر بے شمار خواب مسکرا رہے تھے۔ نجانے اس وقت وہ مجھے کائنات کی سب سے زیادہ خوبصورت شے نظر آرہی تھی۔ اسکا سانولا سلونا پیکر خوابوں کی رعنائیوں میں کھوگیا تھا۔ نادرہ کا یہ انداز میرے لئے انوکھا مگر ایک دلچسپ تجربہ سے کم نہ تھا۔ میں خود بھی اپنے دل کی عمیق گہرائیوں میں ایک

عجیب سا سرور ایک نرالا سا نشہ محسوس کر رہا تھا۔

اس کے بعد کئی پکنک پروگرام بنے۔ کئی حسین مقامات کی سیر کے لئے ہم لوگ ساتھ ساتھ گئے۔ قدرت کے حسین مناظر نادرہ کی قربت سے مزید خوبصورت ہوگئے تھے۔ رفتہ رفتہ ہم جذبوں کے سمندر میں ڈوبتے چلے گئے۔ نادرہ کی آپا اور چھوٹی بہن اکثر ہمارے ساتھ رہیں۔ نادرہ اپنی آپا سے بہت محبت کرتی تھی۔ بات بات میں آپا کا ذکر کرنا نادرہ کی عادت بن چکی تھی۔ وہ تھی بھی بڑی خاموش طبیعت۔ ایک گہری جھیل کی مانند۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا گویا وہ آتش فشاں کی طرح سلگ رہی ہے۔ اور اکثر میں نے انھیں سورج مکھی کی طرح کھلا ہو، اایک ٹک دیکھتا ہوا، ڈوبا ہوا پایا۔ ان کی اس کیفیت کے بارے میں میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ اس خاموش کتاب کی تحریر سے مجھے کوئی مطلب نہیں تھا۔ نادرہ میری غزل تھی۔ جسکا ہر لفظ میرے جذبات سے مزین تھا۔ وہ چاندنی رات مجھے اب تک یاد ہے۔ جس میں کھو کر ہم نے ایک دوسرے سے محبت کے عہد و پیمان بھی کر لئے تھے۔ نادرہ کی محبت نے مجھ میں ایک نئی امنگ ایک نیا ولولہ بیدار کر دیا تھا۔ ایک ساتھ میں نے حسرتوں کے کتنے ہی محل محض نادرہ کی خاطر تعمیر کر لئے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ محبت پروان چڑھتی رہی۔ تصور مہکتا رہا۔ جذبوں کے پھول کھلتے رہے۔ اعظمی صاحب کے توسط سے مجھے ایک اچھی ملازمت مل گئی۔ بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ اچانک میری مسرتوں پر درد کی اوس پڑنے لگی۔ نادرہ کو نجانے کیا ہوگیا کہ وہ مجھ سے دور دور رہنے لگی۔ اسکی آنکھوں کی شمعیں بجھی بجھی دکھائی دینے لگیں۔ اسکا اداس

اداس سراپا ایک بھیانک طوفان کی غمازی کر رہا تھا۔ یہ کیسا حادثہ تھا میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ کہیں اسے مجھ سے نفرت تو نہی ہوگئی۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میرے شب و روز ویران ہونے لگے۔ کوشش کے باوجود کئی دنوں تک نادرہ سے ملاقات نہ ہوسکی۔

ایک دن اچانک راستہ میں نادرہ سے ملاقات ہوگئی۔ کرب کے بوجھ سے گھبرا کر میں نے نادرہ سے ان کیفیات کی وجہ جاننا چاہی۔ میرا لہجہ ٹوٹ چکا تھا۔۔ میں نے پوچھا نینی، آخر کون سی خطا مجھ سے سرزد ہوگئی۔ کن گناہوں کا مجھ سے ارتکاب ہوا جو اس قدر سنگین سزائیں میرے حصہ میں آئیں۔ میں! میں تمہارے بغیر کیسے رہ پاؤنگا نینی۔ میرا گلا رندھ سا گیا۔ آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

اتنا سن کر وہ سسک پڑی۔ اسکی آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ پر گہری اداسی کے سائے ابھر آئے تھے۔ جذبات کے سیلاب کو اس نے روک کر کہا۔ آپ مجھے بیحد پیار کرتے ہیں نا۔... بہت بہت... مگر اس سے کہیں زیادہ... آپا.... آپ کو چاہتی ہے۔ ان کی محبت کا دامن میرے پیار سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسے مت ٹھکرائیے۔ یہ انکشاف مجھ پر چند روز پیشتر اس رات ہوا جب آپا آپکی تصویر کو سینہ سے لگائے نجانے کیسے کیسے خواب بن رہی تھی۔ تب سے میں اپنی کمتری کی آگ میں جھلس رہی ہوں۔ میں آپ کی خوشیوں کے لئے خود کو قربان کرتی ہوں۔ برائے کرم مجھے بھول جایئے اور آپا سے.... شادی کر لیجئے یہی میرے پیار کی معراج ہوگی۔'' نادرہ اتنا کہہ کر جا چکی تھی۔ اور میں اندھیروں کی صلیب پر معلق رہ گیا تھا۔ میرے اطراف تنہائیاں بکھر گئیں تھیں۔ میرا وجود ٹوٹ کر کسی

کٹی پتنگ کی طرح بھٹک گیا تھا۔ میری تمام حسرتوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔
ایسا لگ رہا تھا میری روح میں سناٹے بھر دیئے گئے ہوں۔ سڑک کے
ہجوم میں کھڑا ہونے کے باوجود بھی میں تنہا تھا۔

اسی دن اپنی تمناؤں کی لاش اپنے زخمی کاندھوں پر اٹھا کر میں
لکھنؤ سے لوٹ آیا تھا۔ اور دوبارہ اس شہر میں نہ آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
اس کے بعد تمثینہ جلد ہی میری زندگی کی ویرانیوں میں صبا بن کر آ گئی۔ اور
مجھے عاشو کی خوشبو بخش کر چلی بھی گئی۔

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ لکھنؤ اسٹیشن پر رک گئی۔ اور میرے
خیالات کا تسلسل بھی منقطع ہو گیا۔ میں حال کی دنیا میں لوٹ آیا
تھا۔ اشفاق صاحب میرے منتظر تھے۔ وہ بڑے تپاک سے مجھ سے ملے۔
انکی قد آور شخصیت میں اپنائیت، ملنساری، خاکساری سبھی کچھ تھا۔ ہم لوگ
گھر کے لئے روانہ ہوئے۔

اتنے برس میں لکھنؤ کافی بدل گیا تھا۔ اب بھی عہدِ رفتہ کی دھندلی
دھندلی یادیں قدم قدم پر ابھر رہی تھیں۔ رہ رہ کر ذہن کے دریچوں سے
نادرہ کا سراپا جھانک رہا تھا۔ خیالوں کی مسافت طے کر کے ذہن بوجھل
سا ہو گیا تھا۔

جلد ہی ہم لوگ گھر کے دروازہ پر پہنچ گئے۔ گھر کا دروازہ کھلا
سامنے خوبصورت بھولی بھالی لڑکی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ یک بارگی میں
چکرا گیا۔ وہ ہو بہو پچیس سال پہلے کی نادرہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہی
آنکھیں، وہی انداز، وہی ادائیں۔ سب کچھ وہی۔ ... میں دیر تک اسے
دیکھتا رہا۔ اپنے خیالات کو سمیٹتا رہا۔ یادیں قطرہ قطرہ پگھلتی رہیں۔

اشفاق صاحب نے بتایا یہ سعدیہ ہے۔ میری مرحوم بیوی نادرہ کی انمول نشانی، اکلوتی نشانی۔ میں نادرہ کو زندگی میں وہ سب کچھ تو نہ دے سکا جسکی اسکو تلاش تھی۔ وہ اپنی حسرتیں اپنی خموشیوں میں چھپائے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ میں نے دیکھا سامنے دیوار پر نادرہ کی تصویر آویزاں تھی۔ اس کے چہرہ پر گہری مایوسی تھی۔ وہ مدتوں کی بیمار نظر آرہی تھی۔ اس کی تصویر میں مجھ سے بچھڑنے کے بعد کی طویل داستان عیاں تھی۔ ایسا لگا نادرہ فریم کی قید سے نکل کر باہر آگئی ہے۔ اس کے خشک ہونٹ مسکرانے لگے ہیں۔ شاید وہ کہہ رہی تھی، وہ خواب شکستہ جو کبھی اسکی معصوم آنکھوں نے دیکھے تھے آج ان کی تعبیر میرے سامنے عاشو اور سعدیہ کے روپ میں ایک خوبصورت حقیقت بن کر کھڑی ہے۔

نجانے کس پاکیزہ جذبہ کے تحت میں نے سعیدہ کو سینہ سے لگالیا۔ میری آنکھوں میں پیار اور ممتا کے آنسو تھے۔

اشفاق صاحب اور گھر کے دیگر ملازمین دور کھڑے مسکرارہے تھے۔ اور مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے مدتوں سے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے ٹھنڈے پانی کا کوئی چشمہ میرے ہاتھ آگیا ہے۔ ☆☆☆

انتظار اور ابھی

کئی ماہ صدیاں بن کر گزرے ، انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہوئیں۔لندن سے آج اس کے محبوب کا خط آیا ہے۔لفافہ پر لکھے پتہ کی تحریر دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔اس سے پہلے کتنی مایوس تھی وہ۔اس کے جسم سے تنہائیاں لپٹی ہوئی تھیں۔روتے روتے اسکی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔چہرہ زرد ہو گیا تھا۔دروازہ کو ایک ٹک دیکھتے رہنا اسکی عادت بن گئی تھی۔شاید پوسٹ مین اسکا خط لائے۔وہ.....وہ..سراپا انتظار بن گئی تھی۔یکبارگی آج اسکی تمنا پوری ہوگئی تھی۔پوسٹ مین سے اپنے نام آئے ایک نیلے رنگ کے لفافہ کو لیکر وہ اچھل پڑی۔اسکی آنکھوں کے چراغ جگمگا اٹھے وہ بے تحاشہ پاگلوں کی طرح لفافہ کو چومنے لگی۔یہ لفافہ شاید اسکی خوشیوں کا سرمایہ تھا۔

دیر تک وہ بند لفافہ کو دیکھ کر نجانے کیا کیا شکایتیں کرتی رہی۔ پھر اس کے بعد دیر تک اسے سینہ سے لگائے رہی۔نجانے اس کے چہرہ پر کہاں سے اتنا سکون ابھر آیا تھا۔وہ پھول کی مانند کھل اٹھی تھی۔

بڑی رعونت سے اس نے لفافہ چاک کیا۔اور ایک خاص ادا سے تحریر پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اس کے چہرہ کا ماہتاب زرد پڑنے لگا۔آنکھوں کے چراغ بجھنے لگے۔وہ رفتہ رفتہ اُجڑنے لگی۔خط کی آخری سطر کے ساتھ اس کے عارض آنسوؤں میں کھو چکے تھے۔ وہ ٹوٹ چکی تھی۔بکھر چکی تھی۔اس کے محبوب نے اس خط کے ذریعے یہ مژدہ اسے

سنایا تھا کہ اس نے لندن میں شادی رچالی ہے۔

خط کی تحریر پر جابجا اس کے آنسو بکھر گئے۔ وہ بے جان مورت کی طرح اب بھی محوانتظار دور خلاؤں میں گھور رہی تھی۔

شاید اب اسے موت کا انتظار تھا۔

☆☆☆

مجبوری

آج کا اخبار دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ حکومت نے اس کے کارناموں کی پزیرائی میں ایک لمبا چوڑا آرٹیکل شائع کیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں آنکھوں کے سینکڑوں آپریشن کر کے اندھیری زندگیوں میں اجالے بھر دئے تھے۔ اس کی انگلیوں میں شاید روشنی کی کرنیں پنہاں تھیں جن سے بے نور آنکھیں منور ہو جاتی تھیں۔

وہ اخبار کی تحریری دیکھ کر واقعی اچھل پڑا تھا۔ اس حرکت سے اسکا چشمہ کہیں دور جا گرا تھا۔ شاید اس کے شیشے پتھر سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے تھے۔ اسکی پلکیں تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔

وہ پاگلوں کی طرح ایک ہاتھ میں اخبار تھامے دوسرے ہاتھ کو فرش سے لگائے ادھر اُدھر چشمہ تلاش کرنے لگا۔

شاید وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ کیونکہ وہ مجسمۂ مجبوری بنا ایک ہاتھ سے اخبار تھامے دوسرے ہاتھ سے تحریر کے الفاظ ٹٹولتا ہوا خلاء میں گھور رہا تھا۔ کئی الفاظ خون کے دھبوں میں کھو چکے تھے۔ دوسروں کو روشنی دینے والا خود اندھیروں میں بھٹک رہا تھا۔

☆☆☆
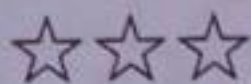
تِکون

اسکی پیدائش سے قبل میری زندگی جنگلوں میں گزرتے ہوئے ان راستوں کی طرح تھی جنکی نہ تو کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ کوئی مقصد۔ جو جنگلی جانوروں کے گزرنے سے محض راستہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور برسات کا پہلا بادل برستے ہی اپنا وجود کھو بیٹھتے ہیں۔

اسکی پیدائش پر مجھے بیشمار مبارکباد کے پیامات موصول ہوئے تھے۔مگر وہ آواز مجھے کہیں سنائی نہ پڑی جسکا مجھے انتظار تھا۔میری بیوی کی سحرآگیں صدا.....وہ بھلا کیوں مجھے اپنے بچہ کی پیدائش کی بہارآفرین خبر سناتی۔ وہ تو پچھلے چھ ماہ سے روٹھ کر مجھ سے الگ ہوگئی تھی۔ بظاہر وہ مجھ سے الگ رہ کر دنیا کی نظر میں علحدگی کا ڈھونگ رچائے ضرور تھی مگر ایک ایسی بھی ڈور تھی جس سے ہم دونوں ہی بندھے تھے۔ وہ ڈور اسکی پیدائش کے روپ میں آشکارہ ہو چکی تھی۔کسی کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی مگر میرے خواب ہنوز بعید از تعبیر تھے۔بدقسمتی سے میں اب تک اسے دیکھ نہیں پایا تھا۔نجانے وہ کیسا ہوگا۔

لوگ اسے دیکھنے کے بعد اسکی ثنا خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔کوئی اسکی دراز پلکوں کی تعریف کرتا کوئی اسکی ننھی منی پیاری پیاری آنکھوں پر اظہار خیال کرتا۔کوئی اسکے پھول سے سراپے کا ذکر کرتا غرض وہ دنیا بھر کے لئے ایک عجوبہ ہی تو تھا۔کبھی کبھی تو میں یہ سب سن کر بیقرار ہو جاتا۔آخر وہ میرا بھی تو بیٹا ہے۔

اس نے آنکھیں کھولیں، دنیا کو غور سے دیکھا۔ ساری کائنات اسکی آنکھوں میں سما گئی۔ مگر اسکی آنکھیں مجھے نہ دیکھ سکیں۔ میں اپنا ہو کر بھی اس سے بیگانہ تھا۔ میں انا کی دیواروں سے گھرا وقت کی یہ ستم ظریفی اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا۔

دن بیتنے لگے۔ موسم بدلنے لگے۔ اسکا بدن بھی رنگ بدلنے لگا۔ کروٹ کروٹ اس میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ ماں کی آغوش اسکی جنت تھی۔ میری بانہوں کا جھولا اب بھی سونا تھا۔

اس کے ننھے منے سراپے میں اب حرکت ہونے لگی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر اب ہلنے لگے تھے۔ زبان سے میٹھی میٹھی کلکاریاں ابھرنے لگی تھیں۔ جب جب ماں ممتا بھرے لہجہ میں تتلا تتلا کر اس سے مخاطب ہوتی وہ جواباً مسکرا دیتا۔ اور میں یہ سب تصورات کے پردوں سے جھانک جھانک کر دیکھتا رہتا۔

میرے جسم کا یہ حصہ مجھ سے جدا ہو کر بھٹک رہا تھا۔ میری انا اور میری بیوی کی ہٹ ان دو اونچی دیواروں کے بیچ اسکا ننھا سا وجود گھٹ گھٹ کر جی رہا تھا۔ غیروں کی بانہیں اسے سہارا دیتی رہی۔ وہ چلتا رہا چلتا رہا۔ سانسوں کا سفر جاری رہا۔

اب وہ اپنی صدا لفظوں میں ڈھالنے لگا تھا۔ سنا تھا کہ اس کی زبان سے پھول جھڑتے ہیں۔ چاروں طرف اسکی خوبصورتی کے چرچے تھے۔ ماں اپنے راجہ کی طفلانہ اداؤں پر نہال ہوئی جاتی تھی۔ اسے دنیا کی اپنے حال کی اپنے ماضی کی حتیٰ کہ اپنے مستقبل کی بھی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ اس چرواہے کی طرح شان بے نیازی سے محو خواب تھی جو جنگل میں اپنی بھیڑوں

کو آوارہ چھوڑ کر خود کسی درخت کے سائے میں سو جاتا ہے۔

اب یہ سنا گیا کہ وہ بہت باتونی ہو گیا ہے۔ اسکی زبان سے الفاظ تیر کی شکل میں نکلتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اسکا ذہن ایک خاص طرز میں ڈھلتا رہا۔ سب کی آنکھ کا تارا آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگا۔ ماں کا بے جا پیار اسے زندگی کے بھیانک موڑ تک لے آیا۔

ایک ایسا موڑ جس سے تین راستے ملتے تھے۔ ایک راستے سے میں چل کر اس موڑ تک پہنچا تھا۔ دوسرے سے غمزدہ ماں اور تیسرے سے ہتھکڑیوں میں جکڑا پولس کے سپاہیوں میں گھرا وہ... ایک ایسا تکون جو کرب واحساس، انا وہٹ کی لکیروں سے ملکر بنا تھا۔

اسکی زبان سے گالیوں کا آبشار نکل رہا تھا۔ اسکا روئے سخن کبھی میری طرف، کبھی اپنی ماں کی طرف تھا۔ وہ ہمیں ماں باپ ہونے کی پاداش میں نجانے کیا کیا بکتا رہا۔ اسکی آنکھوں میں انتقام کی ہولناک آگ تھی۔ خطرناک جذبہ تھا۔ گھناؤنا عزم تھا۔ اسکا جسم لرز رہا تھا۔ اسکا چہرہ بے ترتیب داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ بدن پر گندے کپڑے چڑھے ہوئے تھے۔ وہ کسی موالی سے کم نظر نہیں آرہا تھا۔

میری آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ کر چھلک پڑیں۔ میری انا ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ دور میری بیوی بے جان مورت بنی کھڑی تھی۔ اسکی آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے تھے۔ آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔ ہم دونوں ہی پتھرائی نظروں سے دور جاتے ہوئے، ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے جو ہمارا اپنا بیٹا تھا۔ ہمارے فاصلوں کے درمیان حائل ایک پُل تھا۔ ایک چراغ تھا جسے ہم دونوں ہی نے روشن کیا تھا۔ ☆

خودغرض

شہد سے بھری اس بوتل سے اسے بڑا پیار تھا۔ وہ ہردم اسے اپنی نظر کے سامنے رکھنا پسند کرتی تھی۔ جب جی چاہتا اسے ہونٹوں سے لگالیتی۔ نظروں سے چومتی، سینہ سے لگاتی۔ شہد کی یہ بوتل اسکی زندگی تھی یا زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ۔ اسے پاکر وہ نہال ہوئی جاتی تھی۔

دن گزرنے لگے۔ شہد کی مقدار بتدریج کم ہونے لگی۔ اسے دیکھ دیکھ کر یہ غم کھائے جارہا تھا کہ بوتل آدھی رہ گئی ہے۔ اب شاید اس کے پیار کی مقدار بھی آدھی رہ گئی تھی۔ محبت کی بے ساختگی اب بے اعتنائی کا رنگ اختیار کرنے لگی تھی۔ بوتل اب اس کے پہلو سے اٹھ کر الماری میں جا بسی تھی۔ جب جب اسے ضرورت محسوس ہوتی وہ بوتل کو جادبوچتی، ہونٹوں سے لگاتی اور پھر الماری میں ایک کونے میں ڈال دیتی۔

بوتل میں چند قطرے شہد کے باقی رہ گئے تھے۔ ایک دن اس نے وہ چند قطرے بھی اپنے حلق سے نیچے اتار لئے۔ بوتل پوری طرح خالی تھی۔ اس نے بوتل کو بہ نظر حقارت دیکھا۔ آج اسے یہ بوتل دنیا کی سب سے حقیر شے نظر آرہی تھی۔ وہ اس سے جلدی چھٹکارہ پاجانا چاہتی تھی۔ کچھ سوچ کر اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

ایک جھٹکے سے اس نے بوتل کو دو انگلیوں میں اٹھایا اور پچھواڑے کھڑکی سے گٹر میں پھینک دیا۔ ایک چھنا کا سا ہوا اور آواز فضا میں گم ہوگئی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑکی سے الگ ہوگئی۔

اب اسے شہد سے بھری دوسری بوتل کی تلاش تھی۔ جو اسے بھرپور طمانیت دے سکے

☆☆☆

حوصلہ

رات کا تیسرا پہر بیت چکا تھا۔ سروج کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ اسکی زندگی کا بھی تیسرا پہر گزرنے کو تھا۔ بیتے دنوں کی ایک ایک یاد اس کے سینہ میں تیز برچھی کی طرح چبھ رہی تھی۔ اتنی لمبی عمر جسکا ایک ایک پل یادگار تھا۔ کیسے قسطوں میں اس نے گزاری ہے۔ کھٹی، میٹھی، زخمی بیشمار یادوں کا قافلہ آنسوں کی قطار بن کر اسکی سن رسیدہ آنکھوں سے گزرتا رہا۔ اور آنسوؤں کی یہ شبنم تکیہ میں جذب ہوتی رہی۔

کسی خیال کے تحت وہ بستر سے الگ ہوگئی۔ سامنے دیوار پر کلاک کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ ٹن! ٹن!! اپنے کمرے سے لگے اپنے بیٹے ڈاکٹر نریش کے کمرے کی طرف اس کے قدم اٹھنے لگے۔ ڈاکٹر نریش جوانی کے خوابوں میں مدہوش اپنے بستر میں بے سدھ پڑے نیند کے مزے لے رہے تھے۔ ان کے بے ترتیب بال کشادہ پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر لاثانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اپنی ماں کی نصیحت اور ترتیب کے مطابق دن بھر مریضوں کی خدمت کرنا، دکھیوں کے آنسو پونچھنا انکا معمول تھا۔ زندگی کی پچیس بہاریں وہ دیکھ چکے تھے۔ گو کہ ماں اور چھوٹی بہن سشما کے علاوہ انکا کوئی اور اپنا نہ تھا۔ بہن اپنے گھر جا چکی تھی۔ ایک بہت بڑا ڈاکٹر بن کر غریب سماج کی خدمت کرنا ان کا مشن تھا۔ اپنے مشن کی تکمیل کے بعد ہی وہ زندگی کی دوسری رسمیں پوری کرنا چاہتے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر سروج نے بڑی ہی ممتا بھری نظروں سے بیٹے کو نہارا۔ اسکی بے ترتیب چادر کو درست کیا۔ اور پیشانی پر بکھری لٹوں کو یکجا کر کے اسے چوم لیا۔ ماں کے ہونٹوں کا لمس پا کر ڈاکٹر نریش کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اتنا کہہ کر پھر سو گئے کہ ماں کیا ابھی تک نہیں سوئیں۔

سوچ کی لہروں میں کھوئی سروج بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ اور بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کے ذہن میں یادوں کا کارواں رواں دواں تھا۔ اسکی ستاون سالہ زندگی کا سفر جو پل پل اسکی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایک محشر خیال برپا تھا۔ اور وہ تماشائی بنی سامنے کھڑی تھی۔

کمرے کی ساری اشیاء سلیقہ سے اپنی نشستوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ کمرہ کے ماحول پر اداسی اور مایوسی کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ سامنے کی دیوار پر نریش کے پتاجی مرحوم ماسٹر سریش کی تصویر آویزاں تھی۔ اس پر مصنوعی پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔

تنہائی کے کرب کو سمیٹے، کچھ یاد کر کے سروج ایک بار پھر بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک عجیب سی تذبذب کی کیفیت لئے وہ ٹیبل پر آگئی۔ ٹیبل کی دراز کھول کر اس نے اسمیں سے ایک ڈائری نکالی۔ اس بوسیدہ سی ڈائری میں اسکی زندگی کی بے شمار بے رنگ یادیں لفظوں کا پیرہن پہنے موجود تھیں۔ بڑے انہماک سے وہ ڈائری کی ورق گردانی کرنے لگی۔ پینتیس سال پیشتر ماسٹر سریش کے ساتھ بڑے ارمانوں سے اسکی شادی ہوئی تھی۔ شرمائی، لجائی پلکوں پر خوابوں کا ایک جہاں سجائے وہ ماسٹر سریش کی زندگی میں آگئی تھی۔ وہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ اسکا

باپ پنچایت آفس میں چپراسی تھا۔ غریبی کے باوجود اس نے میٹرک تک کسی طرح تعلیم حاصل کرلی تھی۔ اس کے دو چھوٹے بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ اپنی تعلیمی قابلیت اور مناسب خدوخال کی وجہ سے وہ ماسٹر سریش کو بھا گئی تھی۔ اس کے ماں باپ نے اپنی غربت کا واسطہ دیکر اسے میکہ سے سسرال والوں کو سونپا تھا۔ اسکی غریبی اس کے پیروں کی زنجیر بن کر یہاں بھی اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ جس سے اسکے پیر ہی نہیں اسکی روح بھی زخمی ہوگئی تھی۔

کچھ دن تو بڑے آرام سے گزرے مگر جہیز نہ لانے کے سبب ساس سسر کے طنز کے تیر چلنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہونے لگا۔ چوٹ زخموں کا روپ اختیار کرنے لگی۔ اور پھر زخم خون اگلنے لگے۔ ماسٹر سریش سیدھے سادھے فرمانبردار بیٹے تھے۔ ساتھ ہی بھولے بھالے شوہر بھی۔ وہ سروج کا درد سمجھتے تھے۔ اس کے زخموں پر پھائے بھی رکھتے۔ تھوڑی دیر کے لئے زخموں کی ٹیس میں کمی بھی واقع ہوجاتی مگر اپنے ماں باپ کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی۔ ایسے کربناک ماحول میں نریش نے آنکھ کھولی۔ جلد ہی وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کے آنسو پونچھنے لگا۔ دو سال بعد سشما بھی اس کے غموں میں شامل ہوگئی۔ سشما کی پیدائش کے اگلے سال ہی ماسٹر سریش ایک خطرناک حادثہ کا شکار ہوگئے۔ سروج پر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ اسکی زندگی غم کے کہرہ میں ڈوب گئی۔ ساس اور سسر کی نفرت سیلاب کا روپ اختیار کرنے لگی۔ اسکی زندگی ایک رستا ہوا ناسور کی صورت ہوگئی تھی۔ کوئی لطف، کوئی مزہ اسکی زندگی میں نہ تھا۔ مگر اسے

اپنے ننھے ننھے بچوں کی خاطر جینا تھا۔ نریش اور سشما کی میٹھی میٹھی توتلی توتلی باتیں اسے جینے کا حوصلہ دیتی تھیں۔ ان نازک پھولوں کی آبیاری کرنا اسکی زندگی کا مقصد تھا۔

حکومت کی کمپنسیٹری پالیسی کے تحت اسکی درخواست پر اسے شوہر کی جگہ ملازمت مل گئی تھی۔ اس ملازمت نے اسکی پژمردہ زندگی کو ایک نئی تازگی بخش دی تھی۔ اس کے قدموں کو ایک نیا موڑ مل گیا تھا۔ اس کے حالات میں مناسب تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ ساس سسر بھی اب اس سے خوش تھے۔ ان کی شکایتوں میں رفتہ رفتہ کمی واقع ہونے لگی تھی۔ اب وہ دن رات اپنے خاندان کی کفالت اور خدمت میں مصروف رہتی۔ اپنے بزرگوں کی خدمت اسکا فرض اولین تھا۔ ایسا کرنے میں اسے ایک قسم کا روحانی سکون ملتا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ وقت کے ساتھ اس کے سر کے بالوں میں سفیدی آنے لگی۔ تنہائی کا کرب بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کرب کے ساتھ ساتھ وہ بچوں کی پرورش کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لئے تنہا محو خرام تھی۔ ماسٹر سریش کی کمی کا اسے شدت سے احساس تھا۔ وہ زندہ تھی صرف جینے کی رسم نبھانے کے لئے۔

ماں کی خاص توجہ اور ترتیب کے باعث نریش زندگی کے مختلف مراحل طے کرتا رہا۔ آگے بڑھتا رہا۔ سشما بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا۔ اس کے پاس کرتے ہی ہاتھ مانگنے والوں کی بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ اور انسپکٹر راجیش سشما کو لے اڑے۔ بیٹی کو الوداع کہنے کے بعد

سروج ایک بار پھر نریش کو سنوارنے میں لگ گئی۔ نریش دو سال کے اندر ہی ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر آ گیا۔ اس نے ماں کے پیر چھو کر یہ خوش خبری سنائی کہ اسکا تقرر شہر کے سرکاری ہسپتال میں ہو گیا ہے۔ ماں کی آنکھیں خوشی سے بھر آئیں۔ اسے ایسا لگا جیسے ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے کے بعد اچانک سامنے منزل آ گئی ہو۔

ڈائری میں لکھی آخری سطر پڑھنے کے بعد اس نے ایک سرد آہ بھری۔ اس کی آنکھیں سامنے دیوار پر لٹکی ماسٹر سریش کی تصویر پر ٹک گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا گویا وہ کہہ رہی ہو میرا مشن پورا ہوا۔

تبھی اسے محسوس ہوا ہر بار کی طرح پیچھا کھڑا ہوا نریش اسکی پلکوں سے آنسوؤں کی قبا اتار رہا ہے۔ اور تسلیوں سے پُر اس کے جملے اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

☆☆☆
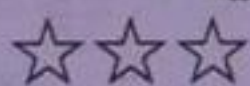
نیا سال نیا کلینڈر

آج میری بیوی بازار سے نئے سال کا نیا کلینڈر لیکر آئی ہے۔ کلینڈر میرے بستر کی ٹھیک سامنے والی دیوار پر آویزاں ہے۔ کلینڈر بظاہر بہت خوبصورت ہے۔اس میں سمندر کے کنارے کا خوبصورت منظر دکھایا گیا ہے۔ دو خوبصورت بچے کنارے پر کھڑے ڈوبتے سورج کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ سمندر میں لہریں اٹھ رہی ہیں۔ بڑا ہی دلفریب منظر ہے۔

میں کلنڈر کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک عجیب سے تاثر میں غرق ہو چکا تھا۔ مجھے اس طرح محو خیال دیکھ کر میری بیوی دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ وہ کبھی کلینڈر کو دیکھتی اور کبھی چپکے چپکے میری طرف توجہ کرتی۔ ایسا لگ رہا تھا گویا وہ اقلیم فتح کر کے آرہی ہو۔ یا پھر کسی پہاڑ کو سر کر گئی ہو۔ اسکی آنکھوں میں کامرانی اور برتری کا ملا جلا تاثر تھا۔ ایک انوکھی سی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ کلینڈر کی توصیف میں میری زبان سے ادا ہونے والے جملوں کی منتظر تھی۔...مگر...

شاید اسے معلوم نہ تھا کہ میں نئے سال کے اس نئے کلینڈر میں وہ دن، وہ تاریخ تلاش کر رہا تھا جو میری زندگی کے لئے آخری ہوگی۔ جن پر میری سانسوں کا قافلہ رک جائیگا۔

☆☆☆
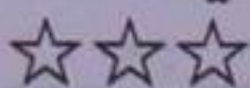
سوشیل ورکر

رات کا دھند لکا پھیلنے لگا تھا۔ وہ بجھے بجھے قدموں سے چلی جا رہی تھی۔ اس کے چہرہ پر مایوسیاں بکھری ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں نمایاں دکھائی دے رہی تھیں۔ آج بابو کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ گھر میں کچھ بھی تو نہ تھا۔ وہ خود بھی صبح سے بھوکی تھی۔ ابھی ابھی اسے خیال آیا تھا کہ اس شہر میں شیلا بھی تو رہتی ہے۔ شیلا جو بچپن کی سہیلی ہے۔ اسکا پتی سوشیل ورکر ہے۔ مایوسی کے اندھیروں میں امید کی شمع جلائے وہ چلی جا رہی تھی۔

گلی کے نکڑ پر گہرا اندھیرا تھا۔ شاید شہر کی بجلی فیل ہوگئی تھی۔ وہ سہمی سہمی قدم اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ اچانک کچھ بدمعاش اس پر جھپٹ پڑے۔ اسکا نحیف بدن کانپ اٹھا۔ ایک ساتھ کئی چیخیں اس کے منہ سے نکل پڑیں۔

ٹھیک اسی وقت ایک سایہ لپکا۔ اور اس نے بدمعاشوں کی پٹائی شروع کردی۔ اچانک بجلی آگئی۔ وہ حواس باختہ دور کھڑی تھی۔ اس کے سامنے کسی جاسوسی فلم کا سین رقص کر رہا تھا۔ بدمعاش بھاگ گئے تھے۔ اس نے اس مرد آہن کی طرف مشکور نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اسے کوئی انسان نہیں فرشتہ نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ نے اس وقت میری مدد فرما کر ایک نیک کام کیا ہے۔'' آپ کا یہ احسان.... فرطِ احساس سے اسکی آنکھیں چھلک آئی تھیں۔ ''ارے آپ خوامخواہ رو پڑیں۔'' میں نے

تو اپنا فرض پورا کیا ہے۔ ہم لوگ سوشل ورکر ہیں۔ سماج میں بے سہارا لوگوں کو سہارا دینا اوران کی امداد کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ آیئے میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دوں.....جی! مجھے میری سہیلی! شیلا کے گھر جانا ہے۔ ارے شیلا! آپکی سہیلی! وہ! وہ تو میری دھرم پتنی ہے۔ آؤ! آؤ! مگر شیلا تو میکے گئی ہوئی ہے۔ بتایئے میں آپ کے کسی کام آسکوں۔

وہ اس شخص کے کردار کی چکا چوند میں ڈوب کر بڑی امید لیکر اس کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوگئی۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلی اسکا چہرہ اشک آلود تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ کپڑے شکن آلود ہو گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کے چند نوٹ تھے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے گھر کی سمت چلی جارہی تھی۔ ٹوٹی! ٹوٹی!! اجڑی! اجڑی!! بار بار اس کے ذہن میں یہ جملہ ابھر رہا تھا۔

''ہم سوشیل ورکر ہیں''!!

☆☆☆

تخلیق

خالق نے نجانے کیا سوچکر دو روحوں کو آسمان سے زمین کی طرف یہ حکم دے کر روانہ کیا کہ جاؤ اور دنیا کے ویرانہ کو آباد کرو۔ اس میں محبت واخوت، ہمدردی اور بھائی چارے کے پھول کھلا دو۔ دونوں روحیں انسانی شکل میں زمین پر رہنے لگیں۔ ان کی دو زندگیوں سے کئی زندگیاں اور کئی زندگیوں سے بے شمار زندگیاں روئے زمین پر بس گئیں۔ رفتہ رفتہ زمین کے ساتھ ساتھ یہ روحیں کئی خانوں میں بٹ گئیں۔ گاؤں شہر، قصبہ، بہن بھائی، ماں باپ وغیرہ۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ انبساط کی چہکار تھی۔ انسانیت کا لباس خاصا خوشنما تھا۔ اس انسانیت نے دلوں میں داخل ہو کر کئی خوبصورت جذبوں کا روپ لے لیا تھا۔ ہر طرف امن وسکون کا بول بالا تھا۔ خالق اپنی اس تخلیق پر مسرور و نازاں تھا۔ وہ بات بات پر اپنے فرشتوں کو انسانوں کی اس دنیا کا طعنہ دیا کرتا تھا۔ اس نے انسانوں کی انسانیت سے خوش ہو کر انھیں اشرف المخلوقات کا خطاب بھی دے دیا تھا۔ اس نے انسانوں کی اس دنیا کو کئی نعمتوں سے بھی آراستہ کر دیا تھا۔

وقت گزرنے لگا۔ رنگ برنگی یہ دنیا نت نئے رنگ بدلنے لگی۔ شادمانی کے نشہ سے بیدار ہو کر خالق نے دیکھا۔ دنیا میں چارسو بارود کا دھواں، آگ، تیر تلوار، بندوق کے گولے اور ان میں گھرا انسان ہر طرف چیخ و پکار، کہرام۔ کوئی رو رہا تھا، کوئی رلا رہا تھا۔ انسانیت

بربریت کے سامنے ایک طرف سہمی سہمی کھڑی تھی۔ سارے رشتے ختم ہوگئے تھے۔ سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوچکے تھے۔ جسم کھوکھلے، اور جذبۂ انسانیت سے بے نیاز تھے۔ گھروں سے اٹھتی ہوئی آہ وبکا اور راستوں پر اٹھتے ہوئے شعلے دیکھ کر ایک بار خالق بھی شرما گیا۔

خالق نے ایک بار پھر دو روحوں کو آسمان سے زمین کی طرف روانہ کیا۔ اس مرتبہ اسکا حکم تھا کہ جاؤ سارے انسانوں کو ختم کردو۔ صفحۂ ہستی سے مٹادو۔ اس دنیا کو مسمار کردو۔

اور...اور...ایک بار پھر یہ دنیا...ویرانہ بن گئی۔

☆☆☆

فرق

بڑی دھوم دھام سے مکان کا سنگ بنیاد رکھنے کی رسم پوری ہوئی۔ خانصاحب آج بہت خوش تھے۔ انکی دیرینہ تمنا پوری ہونے جارہی تھی۔ وہ بھی ایک عالی شان مکان کے مالک ہوجائینگے۔

بڑی تگ و دو، بڑی دوڑ دھوپ اور جانفشانی کے بعد مکان کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ انھوں نے مکان کی پیشانی پر اپنے لختِ جگر کا نام کندہ کروایا۔ اس وقت فرطِ احساس سے ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

پندرہ برس گزر گئے۔ کئی موسم آئے اور گزر گئے۔ گزرے موسموں کی چھاپ اب ان کے بدن سے نمایاں ہونے لگی تھی۔

رات کا ایک پہر بیت گیا۔ کڑاکے کی سردی، یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ، کپکپاتا ہوا بوڑھا بدن جو جگہ جگہ پیوند لگی چادر سے برائے نام ڈھکا تھا۔ یہ وہی خانصاحب تھے۔ جنہیں آج ان کے بیٹے نے گھر سے نکال دیا تھا۔

انھوں نے آخری بار گھر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ٹھیک اسی طرح جب مکان کی تکمیل ہوئی تھی۔ مگر آنسوؤں کے احساس میں قدرے فرق تھا۔

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چل کر وہ اندھیروں میں گم ہوگئے۔

☆☆☆

علاج

وزیر صحت اپنے معائینہ کے دوران مریضوں سے انکی خیریت پوچھ رہے تھے۔ انکے ساتھ ان کا پورا عملہ ڈاکٹر اور نرسز بھی تھیں۔ مریض ازراہِ اثر اثبات میں سر ہلا ہلا کر اپنی کیفیات کا اظہار کر رہے تھے۔

ایک مریض بہ مشکل تمام بستر سے اٹھا۔ اس نے وزیر موصوف کے حضور ڈاکٹر اور نرسوں کی غلط کارکردگی کے بارے میں بآواز بلند، چند جملے کہے۔ وزیر صحت اس مریض کو تسلی دیکر چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے اس مریض کے ایک انجکشن لگایا اور اس مریض کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

شاید اسکی شکایت دور کردی گئی تھی۔

☆☆☆
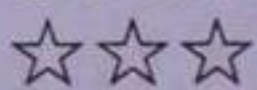
فیس

وہ ایک امید لیکر سٹی کوتوالی اس بدمعاش کے نام شکایت درج کرانے گئی تھی جس نے اس کے ساتھ ریپ کر کے اس کی عصمت کے موتی کو چور چور کر دیا تھا۔

مگر......کوتوالی سے وہ ایک عجیب سی مایوسی چہرے پہ لئے لوٹ رہی تھی۔ اسکی رپورٹ درج نہ ہوسکی تھی۔ کیونکہ وہ رپورٹ درج کرنے کی فیس ادا کرنے سے قاصر تھی۔

کوتوالی کے انچارج نے ریپ کی رپورٹ درج کرنے سے پیشتر بطور فیس مزید ریپ کی خواہش ظاہر کی تھی۔

☆☆☆

سرابوں کی جھیل

سارا ماحول لفظوں کی موسیقی میں ڈوب چکا تھا۔ سامعین پر ایک انوکھا سا نشہ طاری تھا۔ شاعر اب بھی محو ترنم تھا۔ فضائیں رقص کر رہی تھیں۔ کتنے ہی ذہن سرور کے رنگوں میں کھو چکے تھے۔ سامعین کی دھڑکنوں پر ایک شاعر قابض ہو گیا تھا۔ ان گنت چہروں پر ایک انفرادی عکس نمایاں تھا۔ آنکھیں تھیں کہ جذبوں کے سمندر میں مدغم ہو چکی تھیں۔

شاعر کا سراپا چند ہڈیوں سے ملکر بنا تھا۔ مگر ان ہڈیوں میں پوشیدہ نغمات کی ایک بیکراں جھیل تھی۔ اسکی سحر آگیں آواز اور سوز میں ڈوبے ہوئے اشعار لاکھوں دلوں کی دھڑکنوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے اسٹیج پر ہٹپا نزم کا کوئی شو ہو رہا ہے۔ شاعر کا حوصلہ قابل داد تھا۔ کبھی تو وہ فلک بوس پہاڑوں کو پل بھر میں سر کر جاتا، کبھی چٹانوں سے ٹکرا جاتا۔ کبھی قطرۂ آب بن کر گلوں کی آنکھوں میں اتر جاتا۔ کبھی دھواں بن کر فضاؤں میں بکھر جاتا۔ صحرا کو چمن زار بنالیتا۔ سمندر کو پل بھر میں پی جانا اور آسمان سے ستارے توڑ لانا تو اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اچانک مترنم صدا خاموش ہو گئی۔ جیسے ساز سے کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔ شاعر اسٹیج پر لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ کہرام مچ گیا۔ اس کے اطراف لوگوں کا اژدھام تھا۔ لوگوں نے دیکھا تبسم کے پھول بکھیرنے والے، فضا میں نغمات کی قوسِ قزح سجانے والے، مردہ جسموں میں ایک نئی

روح پھو نکنے والے ادب نواز شاعر کا جسم زخم آلود تھا۔ اس کے جسم کا ہر عضو لہولہان تھا۔ زخموں سے رستا ہوا لہو بوسیدہ پیرہن میں جذب ہو رہا تھا۔

اب بھی شاعر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ایک دم اس کے جسم کے مجسّس سے اسکی بیقرار روح پرواز کر گئی۔ شاعر کا وجود سرابوں کی جھیل میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اپنے نغمات فضاؤں میں بکھیر کر وہ بہت دور... بہت دور جا چکا تھا۔ شاعر کی اس کیفیت کا کیا راز تھا کوئی نہ سمجھ سکا۔

☆☆☆

کانچ کے سپنے

پوجا وداع ہو چکی تھی، گھر کا ماحول خامشی کی پرتوں میں کھو چکا تھا۔ ہر طرف سکون تھا۔ سب لوگ شادی کی گہما گہمی اور دوڑ بھاگ کے بعد تھک کر اپنے اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ رات گہری ہو چلی تھی۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوائیں منڈپ میں ادھر ادھر آوارہ پنچھیوں کی طرح گھوم رہی تھیں۔ گھر آئے ہوئے سارے مہمان نیند کے مزے لے رہے تھے۔ ایک رچنا ہی تھی جو بیحد تھکی ہوئی ہونے کے باوجود اب تک جاگ رہی تھی۔ اسکی سوجی ہوئی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

پوجا کے وداع ہوتے ہی اسے ایسا لگا گویا ایک پہاڑ تھا جو اس کے سر سے اتر گیا۔ ذمہ داریاں بھی تو ایک بوجھ کی طرح ہوتی ہیں۔ جن کے انجام تک پہنچنے کے بعد انسان راحت محسوس کرتا ہے۔ پوجا کی شادی رچنا کی سب سے بڑی سب سے اہم ذمہ داری تھی۔ جسے وہ بڑی محنت سے اپنے انجام تک پہنچا پائی تھی۔

آج رہ رہ کر اسے اپنے مرحوم پاپا کی یاد آ رہی تھی۔ جب وہ دفتر سے آتے تھے اور رچنا کو اپنے کاندھے پر اچھال کر اکثر ماں سے کہا کرتے تھے۔ ساوتری افسوس مت کیا کر کیا ہوا اپنے یہاں کوئی بیٹا نہیں ہے تو۔ اپنی رچنا کوئی بیٹے سے کم ہے کیا۔ دیکھنا وہ بڑی ہو کر ایسے کام کر دکھائے گی کہ بیٹا بھی کیا کریگا۔ اتنا کہہ کر پاپا اسکی پیشانی کو چوم چوم لیتے تھے۔

یہ سب سوچ کر اسکی آنکھیں بھر آئیں۔ بھیگی پلکوں کو اٹھا کر اس

نے سامنے پھیلے ہوئے اندھیرے کی چادر دیکھی جس میں ساری کائنات سمٹی ہوئی تھی۔ دور ایک کنارے پر اسے اپنی زندگی بھی نظر آئی جس کے ارد گرد ایسے ہی بھیانک اندھیرے لپٹے ہوئے تھے۔ اس نے دور تک پھیلی ہوئی اپنی زندگی پر نظر ڈالی۔ جو ریگستان کے اس چٹیل میدان کی طرح نظر آئی جسمیں دور دور تک خوشیوں اور تمناؤں کا کوئی نخلستان نہیں تھا۔ اسکی زندگی میں اگر ارمان تھے تو اس سراب کی طرح جو ریگ صحرا پر سر ابھارتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں۔

وہ جب میٹرک اول نمبر سے کامیاب ہوئی تھی تب پاپا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ رزلٹ والے دن تو گھر میں ایسا لگتا تھا گویا دیوالی آگئی ہے۔ پاپا نے بڑے جذباتی ہو کر کہا تھا مینکا، ڈالی، پوجا، تم سب رچنا دیدی جیسا بننا۔ رچنا تم سب کا آئیڈیل ہے۔ اس وقت یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں نے ہفت اقلیم فتح کر لی ہے۔ بہاروں کا یہ موسم کب ختم ہوا اسکا احساس اسے اس وقت ہوا جب اچانک پاپا سینہ میں درد کا طوفان لئے ساری ذمہ داریاں اسے سونپ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔

ابھی وہ اپنی آنکھوں کا کوئی سپنا بھی نہ سنجو سکی تھی، اسکے دل میں کسی ارمان نے سر بھی نہ ابھارا تھا کہ گھر کی تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے سر پر آ لٹکا۔ اس نے ایک ایک کر کے ماں اور تینوں بہنوں کے آنسو پونچھے۔ اسکی زندگی میں ایسا کئی بار ہوا کہ وہ رونے والوں کے آنسو پونچھتے خود بھی زار و قطار رو پڑی تھی۔

کئی دن زخمی پرندوں کی طرح تڑپتے ہوئے گزر گئے۔ درد جب

حد سے گزرتا ہے تو از خود دوا بن جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اس کے ساتھ ہوا۔ ایک نئے حوصلے اور نئی ہمت کے ساتھ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور خوشی خوشی حالات کا زہر پینا شروع کر دیا۔ چند دنوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد حکومت کی کمپنسٹری پالیسی کے تحت اپنے پاپا کی جگہ اسے ملازمت مل گئی۔ بھنور میں پھنسی اس کے خاندان کی کشتی کو ایک بار پھر کنارہ مل گیا۔

مینکا، ڈالی اور پوجا جو کئی دنوں سے اسکول نہیں جا رہی تھیں اب اسکول جانے لگی تھیں۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد جب سب اکٹھا ہوتیں سب دن بھر کی داستانیں اپنی بڑی بہن کے گوش گزار کرتیں۔ ماں کے لب جو تقریباً ہنسنا بھول چکے تھے۔ اب رفتہ رفتہ مسکراہٹ سے آشنا ہونے لگے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہاروں کا وہ گزرا ہوا موسم پھر سے لوٹ رہا ہے۔ خوشیوں کی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔

یہ وقت بڑا ظالم ہے۔ جب دبے پاؤں گزرتا ہے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ کئی موسم آئے اور بیت گئے۔ مگر کسی کی بھی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ اس کے جذبات ابھار سکے۔ اس نے اپنے تمام خواب اپنے جذبے اپنی ذمہ داریوں کی سلوں کے نیچے دفن کر دئے تھے۔ کون تھا جو اس کے جذبوں کی ترجمانی کرتا۔ اسکی بھی اپنی زندگی تھی۔ اپنے ارمان تھے۔ بہنیں تو خیر ان سے بے خبر اپنی پڑھائی میں مگن تھیں۔ مگر ماں کی جہاندیدہ آنکھیں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ محسوس کر رہی تھیں۔ رو رہی تھیں۔ اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا۔

وقت کا دھارا بہہ رہا تھا۔ لمحے پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ مینکا بی۔اے۔ کے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوگئی تھی۔ ڈولی

بی.اے. فرسٹ ائیر اور پوجا میٹرک میں جا چکی تھیں۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ گھر کے کام کاج میں بھی ماں کا ہاتھ بٹاتیں ساتھ ہی بڑی بہن کی خدمت بھی کرتیں۔

دفتر میں کام کرتے ہوئے کئی سال بیت گئے۔ کئی موسم آئے اور گزر گئے۔ اب کے موسم نے ایک نئی انگڑائی لی۔ اس سال راجیش گوالیار سے ٹرانسفر ہوکر اس کے دفتر میں جوائن ہو گیا۔

راجیش با اخلاق اور ہنس مکھ لڑکا تھا۔ جلد ہی وہ اپنے نیچر کے باعث سب کا چہیتا بن گیا۔ رچنا خاموش اور سنجیدہ نیچر کی تھی۔ اور فطرتاً وہ کم سخن واقع ہوئی تھی اسلئے دفتر کے لوگ اس سے بہت کم بات کرتے تھے۔ اور وہ بھی بس کام سے کام رکھتی تھی۔ مگر راجیش اکثر اسکی ٹیبل پر آ کر زبردستی اس سے گفتگو کرتا۔ اوٹ پٹانگ باتیں کر کے اسے ہنسنے پر مجبور کر دیتا۔ کئی بار وہ اسے جھڑک دیتی مگر راجیش سب کچھ ہنسی میں ٹال جاتا۔ رفتہ رفتہ وہ راجیش سے مانوس ہونے لگی۔ شام کو وہ اکثر ساتھ ساتھ دفتر سے نکلنے لگے۔ مگر محدود دائروں میں۔ سڑک کے جس موڑ سے وہ بچھڑتے اس کے بعد کے بچے ہوئے راستہ پر اکیلی چلتے ہوئے وہ راجیش کے متعلق ہی سوچتی۔

بیتے دنوں کے ساتھ ساتھ ان کی رفاقت کے پودے میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ وہ اب ایک دوسرے کی ذاتی زندگیوں میں بھی جھانکنے لگے تھے۔ راجیش نے بتایا کہ وہ اس دنیا میں اکیلا ہے۔ حالانکہ اس کی ایک بہن تھی جو شادی کے بعد جہیز کی لعنت کی نذر ہوگئی۔ ماں باپ پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ ایک بڑا بھائی تھا۔ بھابی تھی۔ بھابی کے برے

سلوک کے باعث اسے گھر چھوڑنا پڑا۔ دوسروں کے دکھ درد بانٹنا اور ہنسی کی کلیاں بکھیرنا اسکی زندگی کا مقصد ہے۔ راجیش کے خیالات سے وہ ایک دن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس وقت نجانے کن جذبوں سے مجبور ہوکر اس نے راجیش کے سامنے اپنی مختصر داستان غم رکھ دی تھی۔

ان دنوں مینکا اور ڈولی کے رشتے آئے اور رشتہ داروں کے مشوروں پر انکی رسم شادی اپنے اختتام کو پہنچی۔ راجیش ان ذمہ داریوں کی تکمیل میں رچنا کے ساتھ ساتھ رہا۔ اسکی بے لوث خدمت اور ایثار نے رچنا کے دل میں اسکی عزت اور بڑھادی تھی۔ راجیش کی رفاقت نے رچنا میں کافی تبدیلیاں رونما کردی تھی۔ اس کے چہرہ کی زردی اور لبوں کی خموشی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی تھی۔

ایک دن دفتر سے نکل کر وہ لوگ کافی ہاؤس پہنچ گئے۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے رچنا نے محسوس کیا راجیش آج اسے بڑی عجیب نظروں سے نہار رہا ہے۔ اسے اسکی آنکھوں میں آج شوخی کی جگہ سنجیدگی کا تاثر دکھائی دے رہا تھا۔ آخر وہ اس سے پوچھ ہی بیٹھی راجیش آج تم ایسا کیا دیکھ رہے ہو۔ راجیش نے کہا رچنا آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ بولی کہو! کچھ کہنے میں جھجک کیسی۔! راجیش آسمان میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ آخر ہمت یکجا کر کے کہنے لگا۔ رچنا میں... تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں اپنا شریک زندگی بنانا چاہتا ہوں۔ میری آنکھوں نے جو بھی سپنے دیکھے ہیں ان کا عکس تم ہو صرف تم۔

رچنا کو، یوں لگا جیسے راجیش بہت دور زمین کی گہرائیوں سے کچھ کہہ رہا ہے۔ اس نے راجیش کی سمت بجھی بجھی نگاہوں سے دیکھا یکا یک

اسکی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ''راجیش تمہارے سپنے کانچ کے سپنے ہیں۔ جو جلد ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ کافی ہاؤس سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد راجیش کئی دنوں تک رچنا کا سامنا نہ کر سکا۔ ایک دن رچنا کو اپنی ٹیبل پر ایک سلیپ ملی۔ جس میں لکھا تھا۔ ''رچنا زندگی کے ہر موڑ پر میں تمہارا انتظار کرونگا۔ میرے سپنے کانچ کے سہی، مگر بے رنگ نہیں ہیں۔''

یہ جملے پڑھ کر اسکی آنکھیں بھر آئیں۔ ان دنوں ہی پوجا کی شادی کا سلسلہ چل پڑا۔ جہیز کے مسئلہ کو لیکر کئی رکاوٹیں آئیں۔ طرح طرح کی باتیں ہوئیں۔ مگر وہ تنہا ہی ان مسائل سے جوجھتی رہی۔

بالآخر پوجا وداع ہو چکی تھی۔ رات بھی گہری ہو چلی تھی۔ آج کی رات اسے اپنے اکیلے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ رچنا کو لگ رہا تھا آج وہ کتنی اکیلی ہے تنہا تنہا زندگی کے سنسان راستہ پر دور دور تک تنہائیاں بکھری ہوئی ہیں۔ کئی آنسو اسکی آنکھوں سے نکل کر دامن میں جذب ہو گئے۔ تبھی اسے اپنے کاندے پر کسی کے لمس کا احساس ہوا اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا راجیش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر تھا۔

سیاہ رات چاندنی کا آنچل اوڑھے اب سنہری ہو چلی تھی۔
موسم کی یہ انگڑائی انتہائی مسحور کن تھی۔

☆☆☆
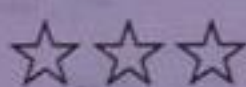
انٹرویو

باس کے روم سے لگا وسیع ہال ہے۔ جس میں متعدد ٹیبلیں لگی ہیں۔ سوائے ایک کے ساری ٹیبلوں پر کلرک، اسٹینو، ٹائپسٹ وغیرہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ اس خالی ٹیبل کے لئے آج انٹرویو ہونے والا ہے۔ باس کے چیمبر کے باہر لانگ بینچ پر انٹرویو کے لئے آئی چند لڑکیاں بغلوں میں فائلیں دبائے سہمی سہمی سی بیٹھی ہیں۔ جو بھی لڑکی اس پوسٹ کی اہل قرار دی جائے گی اسے وہ خالی ٹیبل دے دی جائیگی۔

بالآخر ٹیبل پُر ہوگئی۔ ابھی ابھی ایک خوبصورت لڑکی باس کے روم سے انٹرویو دیکر اس ٹیبل پر آئی ہے۔ ہال میں موجود سارے اسٹاف کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے گویا وہ شوکیس میں رکھا لیٹیسٹ ڈیزائن کا کوئی خوبصورت کھلونا ہے۔ اور شاید اس لئے بھی کہ وہ باس کے روم سے گزر کر اس ٹیبل تک پہنچی ہے۔ جو اس دفتر کی قدیم روایت بھی ہے۔

اسکی مجوب نگاہیں کچھ عجیب سے تاثر کا اظہار کر رہی ہیں۔ اسکی دراز زلفیں اس کے شانوں پر بکھر گئی ہیں۔ کچھ شوخ لٹیں پیشانی پر ابھرے پسینہ میں الجھ گئی ہیں۔ اس کے بدن میں یہ کیسی لرزش ہے۔ اسکا لباس شکن آلود ہے۔ اس کے کپکپاتے ہونٹ پژمردہ گلاب کی طرح نظر آرہے ہیں۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ہلکا سا اطمینان جھلک رہا ہے۔

شاید اس لئے کہ اس کے بھٹکتے وجود کو یہ خالی ٹیبل میسر آگئی ہے۔

☆☆☆
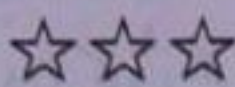
تجزیہ

رامو ہماری کالونی کا لاڈلا چہیتا دودھ والا تھا۔ وہ ہر صبح اپنی سائیکل پر سوار کالونی میں دودھ تقسیم کر کے اڑتے ہوئے بادل کی طرح گزر جاتا تھا۔ اکثر میری آنکھ اسکی میٹھی آواز کے ساتھ کھلتی۔ میں سیکنڈ فلور اپنے روم کی کھڑکی سے لگے بستر پر لیٹا لیٹا دور تک اسکی جاتی ہوئی سائیکل کو دیکھتا رہتا۔

رامو کا سراپا بڑا متاثر کن تھا۔ خوبصورت بدن، مناسب خدو خال ایک خاص اسٹائل میں سلجھے ہوئے بال سادہ سا لباس۔ پیروں ین ٹائر کے بنے جوتے۔ پرانی زنگ آلود سائیکل، جس پر لدی دودھ کی کندی۔ اس کا بھرا بھرا جسم پہلی نظر میں متاثر کئے بنا نہیں رہتا تھا۔

ہماری کالونی میں ٹھیک آخری سرے پر پچھلے ہفتہ ہی ایک ماڈرن فیملی آبسی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر سنہا ڈپٹی ڈائریکٹر ہو کر آئے ہیں۔ سنہا صاحب تو خیر ۴۸ سال کے ادھیڑ شخص تھے۔ مگر مسز سنہا کافی اسمارٹ، خوبصورت تیز وطرار عورت تھی۔ ان کی نیلی نیلی آنکھوں میں ایک عجیب سی پیاس نظر آتی تھی۔ وہ اکثر دودھ کے بہانے رامو سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے دیکھا رامو نے دودھ کا دھندہ چھوڑ کر مسٹر سنہا کے یہاں نوکری کر لی ہے۔ مسز سنہا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اکثر پارٹیوں، کلبوں میں رامو کے ساتھ جاتی اور دیر رات گئے لوٹتی۔ رامو کا صبح مجھے جگانا اور اسکی جانی پہچانی آواز کافی عرصہ تک یاد آتی رہی۔ نجانے

کیوں مجھے اس سے ایک قسم کی انسیت سی ہوگئی تھی۔

ایک رات میں نے دیکھا مسز سنہا شراب کے نشہ میں دھت راموکی بانہوں میں جھولتی چلی آرہی ہیں۔ رامو نفیس لباس میں ملبوس نجانے کیا کیا بکتا چلا آرہا تھا۔ ان کی ناگوار حرکتیں میری آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ اور نہ ہی وہ جملے میرے کان سن پائے جو نشہ کی حالت میں مسز سنہا بک رہی تھیں۔ رامو کی زندگی کا یہ تغیر میرے لئے باعث حیرت ضرور تھا۔

رامواب وہ پہلے والا رامو نہ تھا۔ وہ راہ بھٹک گیا تھا۔ اسکا خوبرو سراپا نجانے کیا سے کیا ہوگیا تھا۔ اسکا چہرہ زرد زرد سا دکھائی دیتا تھا۔ وہ مضمحل اور بیمار لگ رہا تھا۔ اسکا جسم نچوڑے ہوئے کپڑے کی طرح نظر آتا تھا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ کچھ دن بعد سنا گیا کہ راموکو جیل ہوگئی ہے۔ مسٹر سنہا نے رامو پر چوری کا الزام لگایا تھا۔ رامولاکھ گڑ گڑاتا رہا مگر اسکی ایک نہ سنی گئی ۔ کچھ دنوں بعد مسٹر سنہا کا تبادلہ ہوگیا۔ مسز سنہا بھی ان کے ساتھ ایک نئی کھوج میں چلی گئیں۔ اس وقت وہ راموکو پوری طرح بھول چکی تھیں۔

اور آج خلاف توقع میری نیند کھل گئی۔ راموکی وہی پیاری پیاری آواز سنائی پڑی۔ دودھ والا! دودھ والا! میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا بوسیدہ پیرہن زیب تن کئے، زنگ آلود سائیکل پر دودھ کی کنڈی لئے رامو دور رینگتے ہوئے کیڑے کی طرح نظر آیا۔ شاید اپنے ماضی کا تجزیہ کرنے کے بعد اسے یہی راستہ حاصل ہوا تھا۔ نجانے کیوں مجھے ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہورہا تھا۔

☆☆☆
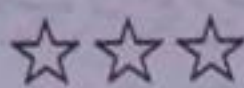
جیون کے رنگ

دینو کاکا نے بیلوں کی جوڑی آم کی گھنی چھایا تلے باندھ دی۔ اور ہرے چارے کی دو پولیاں انکے سامنے ڈال کر نہر کے بہتے ہوئے شفاف پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ من ہی من سرکار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پاس رکھی کھانے کی پوملی اٹھائی۔ اتنی دیر میں آس پاس کے کھیتوں سے مرلی، اشوک، شکیل اور بھرت بھی دینو کاکا کے قریب اپنی اپنی پوٹلیاں لئے آپہنچے۔ سب نے کاکا کو رام رام کیا۔ بھرت کہنے لگا'' کاکا تمہارا کام کا سمے تو بس گھڑی کا کانٹا ہے کانٹا۔ ڈیڑھ بجا اور بس بیلوں کی چھٹی۔ دینو کاکا نے آم کے موٹے تنے سے ٹیک لگائی اور کہنے لگے'' یہ سب بھگوان کی کرپا ہے بھائی''۔ زندگی بھر سرکار کی نوکری کرتے رہے۔ سمے کے تال پر تھرکتے رہے۔ اسی سے سیکنڈ اور منٹ کا تھوڑا بہت حساب آگیا۔

سب لوگ نہر کے بہتے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھونے لگے۔ آم کی چھایا تلے ایک بڑی سی موٹی دری بچھائی گئی۔ ڈبوں کے کھلتے ہی بھانت بھانت کی سوندھی سوندھی کھانوں کی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ سب دینو کاکا کے منتظر تھے کہ وہ ابتداء کریں۔ حسب معمول دینو کاکا نے شکیل کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بھگوان کا نام لیکر سب سے کھانے کو کہا۔ سامنے کیاریوں میں کل کل کرتا بہتا نہر کا پانی ماحول کو ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ دھوپ میں تیزی آگئی تھی۔ دھوپ کی تمازت میں آم کی یہ گھنی چھایا مزید دلکش ہوگئی تھی۔ دینو کاکا بار بار سامنے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتے بڑی دیر

سے ان کے ذہن میں پانی کے متعلق نجانے کونسی بات اٹکی ہوئی تھی۔ جو وہ سب کو بتا کر دماغ سے نکال دینا چاہتے تھے۔

انھوں نے کہا اے اشوک، ہماری سرکار بڑی بھلی ہے۔ دیکھو پانی کا یہ انتظام کر کے ہم پر ہی نہیں اس دھرتی ماں پر بھی اس نے کتنا بڑا اپکار کیا ہے۔ دھرتی ماں کی یہ گود دیکھ کیسی ہری ہوگئی ہے۔ سب نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ گویا وہ دینو کاکا کی ہر بات سے پوری طرح سہمت ہوں۔

کھانے کا دور ختم ہوا تو سب لوگ دینو کاکا کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ اشوک اور بھرت، مرلی کو گم سم دیکھ کر اسکا مذاق اڑانے لگے۔ اگلے ماہ مرلی کا بیاہ ہونے والا تھا۔ پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے دینو کاکا بولے۔ ''شادی انسان کی زندگی کا سب سے خوبصورت موڑ ہے۔ کھیت کی پگ ڈنڈی پر نگاہیں جمائے وہ تھوڑی دیر کے لئے کھو گئے مانو ماضی کی کسی پرت کو کرید رہے ہیں۔ ٹھنڈی آہ بھر کر وہ آسمانوں کی گہرائیوں میں گھورتے رہے۔ پھر مرلی سے مخاطب ہوئے'' بیٹا! شادی کے بعد بہو کو خوب خوب پیار دینا۔ جب جب بہو رانی میرے لئے گاؤں کی ان ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیوں سے ہو کر کھیت کی ان کانٹے دار منڈھیروں کو سر کر کے کھانے کی پوٹلی لئے آئے گی اسکا آنچل میرے پیار سے لبریز ہوگا۔ تب دیکھنا زندگی کا رنگ، کتنی حسین ہوگی زندگی اس وقت۔ سب دینو کاکا کی باتوں کو غور سے سننے لگے۔ مگر مرلی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ تو شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ بھرت ضد کرنے لگا کاکا کوئی کہانی سناؤ۔ مزہ آجائے کوئی کام کی بات ہو جائے۔

دینو کاکا نے اپنے لال ہونٹوں سے ایک پچکاری بھری اور گویا ہوئے ''مرلی کی شادی کی بات سے ایک قصہ یاد آیا۔ بات ان دنوں کی ہے جب میں شہر میں ایک سرکاری دفتر میں چپراسی تھا۔ رامو شہر کا رہنے والا میرا ایک دوست تھا وہ بھی اسی دفتر میں چپراسی تھا۔ میں گاؤں سے شہر آیا تھا۔ تمہاری کاکی کو شہر کا ماحول راس نہ آیا سو وہ گاؤں میں میرے ماتا پتا کے سنگ رہا کرتی تھی۔ جب چھٹی ملتی میں اپنے گاؤں آجاتا۔ رامو ان دنوں کنوارا تھا۔ اسے شہر کی ہوا لگی ہوئی تھی۔ بنا سنورنا، فیشن کے کپڑے پہننا، فلمیں دیکھنا اسکا شوق تھا۔ وہ تھا بھی بڑا اونچا جاڑا ابھرا بدن گینہواں رنگ، کڑیل جوان۔ دن بھر ہنسی مذاق میں اسکا سمے بیتا۔ رامو دل کا بڑا اصاف تھا۔ وہ میری بڑی عزت کرتا تھا۔ دوپہر کا بھوجن وہ میرے ساتھ ہی کرتا تھا۔ بھوجن کے بعد میری ڈبیہ سے پان کی گلوری کھانا کبھی نہ بھولتا تھا۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ اور وہ دن بھی آن پہنچا جب اسکی شادی ہونے والی تھی۔ شادی گھر بار کی وہ پہلی رسم ہے جسے ہر انسان کو نبھانی ہوتی ہے۔ اس موڑ سے زندگی کا حسین سفر شروع ہوتا ہے۔ رامو بڑا خوش تھا وہ گھنٹوں خود کو آئینہ کے سامنے کھڑا کر کے نہارتا رہتا تھا۔ اتنا کہہ کر دینو کاکا نے ایک سرد آہ بھری۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی۔ سب لوگ بڑے انہماک سے ان کی باتیں سننے لگے۔

پان کی ایک اور گلوری منہ میں رکھنے کے بعد دینو کاکا پھر کہنے لگے۔ رامو کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ شادی میں گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے میں ہر رسم میں شریک رہا۔ لکشمی! رامو کی بہاتا بڑی شریف اور سگھڑ عورت تھی۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی مگر تھی پتی ورتا۔ وہ میری بڑی عزت

کرتی تھی۔ میں بھی اسے اپنی بہو کی طرح مان سمان دیتا تھا۔

شادی کے بعد رامو کی زندگی موسموں کی طرح بدلنے لگی۔ اسکی خوشیوں پر اوس سی پڑنے لگی۔ شادی کے بعد چار سال بیت گئے مگر اس کے یہاں اولاد نہ ہوسکی۔ رامو اب اداس اداس رہنے لگا تھا۔ وہ اپنے دل کا درد میرے سامنے رکھ دیتا۔ میں اسے سوائے تسلیوں کے کیا دیتا۔ اسکی ڈھارس باندھتا۔ مثالیں دیتا کہ ہمارے گاؤں میں سنتوں کے یہاں آٹھ سال بعد اولاد ہوئی۔ رامو کو ان مثالوں سے بڑی ہمت ملی۔ وہ آنسو پونچھ کر پھر سے اپنے کام میں جٹ جاتا۔ آخر اسکی مراد پوری ہوگئی۔ شادی کے چھٹویں سال اس کے گھر ساوتری نے جنم لیا۔ رامو کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا۔ اگلے سال رامو کے گھر دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ اب رامو کی اولاد کی خواہش نے ایک دوسرا روپ اختیار کیا۔ وہ اب ایک بیٹا چاہتا تھا۔ بیٹے کی خواہش میں ہر سال ایک بیٹی جنم لیتی رہی۔ اس طرح پانچ بیٹیوں نے رامو کا گھر آباد کیا۔

مہنگائی اور بندھی ہوئی تنخواہ! خرچ کا بوجھ بڑھنے لگا۔ گھر کی ضرورتوں میں روزانہ اضافہ ہونے لگا۔ میں اسے لاکھ سمجھاتا رہا رامو اپنے پریوار کو سیمت کرلے میری صلاح مان مگر وہ نجانے کس مٹی کا بنا تھا۔ اسکی ہنستی کھیلتی زندگی میں جو انقلاب آیا وہ مجھ سے چھپا نہ تھا۔ بننے سنورنے کا شوق قریب قریب ختم ہوگیا تھا۔ اس کے دن رات عموماً سرکاری وردی میں ہی گزرنے لگے۔ کئی کئی دن بنا داڑھی بنائے ہی گزر جاتے۔ اسکی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑنے لگے تھے۔ لکشمی وقت سے پہلے ہی بوڑھی نظر آنے لگی تھی۔

دن ماہ و سال بن کر گزرنے لگے۔ ساوتری جسے رامو چند کلاس ہی پڑھا پایا تھا اب جوانی کے آنگن میں قدم رکھ رہی تھی۔ رامو کو اب اسکی شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کے سسرال والوں کی کوششوں سے ساوتری کی شادی جلدی ہی کہیں طے ہوگئی۔ لڑکا اوسط فیملی کا تھا۔ جیسے تیسے ساوتری کو وداع کیا گیا۔ رامو قرض کے بوجھ تلے دب گیا۔

ساوتری اپنے ساتھ غریبی کی سوغات لے گئی۔ غربت ایک ابھیشاپ ہی تو ہے۔ جہیز نہ لانے کے سبب ساوتری کو دن رات اپنے سسرال والوں کے طعنے سہنا پڑتے۔ شادی کیا ہوئی اس پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ساوتری کے حالات سے رامو کا دل چھلنی تھا۔ اپنے بچوں کی حالت زار، گھر کی بکھری بکھری حالت اسے خون کے اشک رلاتی۔ رامو کی زندگی میں آئے اس طوفان کو میں نے بڑے قریب سے دیکھا محسوس کیا۔ جیون کے یہ انوکھے رنگ دیکھ دیکھ کر میں من ہی من کڑھتا تھا۔ سمے آخر اس سے کب تک چھل کرتا رہیگا۔

گزرے دنوں کے ساتھ ساتھ رامو کے جیون پر پڑی بدنصیبی کی کالی چھایا اور گہری ہوتی چلی گئی۔ لگاتار حالات سے سنگھرش کرتے رہنے سے وہ بڑا کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے ٹی بی ہوگئی ہے۔ ایک دن وہ بھی آیا جسکا مجھے ڈر تھا۔ رامو خون کی الٹیاں کرتا ہوا ہم سب کو چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا۔

اس کے بعد لکشمی کا کیا ہوا۔ اس کے بچے کس حال میں ہیں مجھے کچھ نہیں معلوم کیونکہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں شہر چھوڑ کر گاؤں چلا آیا اور من کے بہلاوے کی خاطر کسی طرح دھرتی ماں

کی سیوا کر کے اپنا سمے کاٹ رہا ہوں۔

دینو کاکا کی یہ کہانی سن کر سب اداس ہو گئے تھے۔ شکیل نے کہا کاکا! اگر رامو سمجھداری سے کام لیتا جتنی چادر دیکھتا اتنے پیر پھیلاتا تو شاید اسکا یہ انجام نہ ہوتا۔ دینو کاکا ایک آہ بھر کر بولے ''ہاں بیٹا تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ یہ ہم سب کے سوچنے کا وشے ہے۔ تم سب کے سوچنے کی بات ہے۔

شام ہو چلی تھی۔ سورج بھی دھیمی چال سے اپنا سفر تمام کر رہا تھا۔ پرندے اپنے گھونسلوں کی جانب چل پڑے تھے۔ آسمان پر شفق پھیلنے لگی تھی۔ ہوائیں مست مست چال سے چل کر شام کا استقبال کر رہی تھیں۔

سب لوگ دینو کاکا کو رام رام کر کے اپنے اپنے کھیتوں کی سمت چل پڑے۔ اور دینو کاکا بھی بیلوں کی جوڑی لیکر بجھے بجھے قدموں سے چلنے لگے۔

وقت کا دھارا اب بھی بہہ رہا تھا۔

اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

☆☆☆
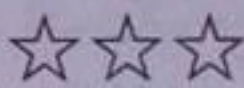
چیختی خاموشی

سرکاری عملہ دہشت گردوں کی تکفین عمل میں لا کر جا چکا تھا۔ رات کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ ماحول پر ایک قسم کی ہیبت طاری تھی۔ سائیں سائیں کرتی سرد ہوائیں زمین پر بکھرے سوکھے پتوں کو روند کر ماحول کو مزید لرزہ براندام کر رہی تھیں۔ شہر خموشاں ... مگر چاروں سمت چیختی خاموشی۔ جو سنی تو جا سکتی نہیں البتہ محسوس کی جا سکتی تھی۔ سناٹوں کی چاپ خشک پیڑوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی۔ کبھی کبھی چمگادروں کے پھڑ پھڑانے سے فضا میں ایک بے ہنگم سا ارتعاش ابھرتا اور پھر خاموشی کا تسلط...

بوڑھی نظیرن اپنے میلے کچیلے دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے بوسیدہ سے لباس میں، موٹے فریم کا چشمہ لگائے، پھٹی پرانی چپلوں پر سوار حواس باختہ سسکیوں کو سمیٹے ہوئے، آہستہ آہستہ ان تازہ قبروں کی سمت بڑھنے لگی جو ابھی ابھی سرکاری عملہ کے ہاتھوں تعمیر کی گئی تھیں۔ خوف و ہراس سے اسکا کمزور سراپا کپکپا رہا تھا۔ سرد ہواؤں کے جھکڑ الگ پریشان کئے ہوئے تھے۔ مگر نجانے وہ کونسا جذبہ تھا جو بوڑھی نظیرن کو آگے گھسیٹ رہا تھا۔ قبروں پر اس نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ سوچنے لگی کونسی قبر امجد کی ہو سکتی ہے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ایک قبر کی گیلی مٹی کو چھوا۔ سرد مٹی برف ہو رہی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے وہ قبر کو اس طرح چھو رہی تھی گویا وہاں کوئی لیٹا ہے اور فرط شفقت سے وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہو۔ دبی دبی

سسکیوں کے درمیان اس کے موٹے فریم کے پیچھے سے جھانکتی آنکھیں چھلک پڑیں۔ چند قطرے نکل کر قبر کی مٹی میں روپوش ہو گئے۔ اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے نجانے کونسا جملہ نکلا جس کے الفاظ ٹوٹے پھوٹے اور بے صدا تھے۔ اسی اثناء میں کسی پرندہ کے اڑنے سے ماحول مرتعش ہوا تھا۔ وہ قبر سے ذرا دوری پر شریفہ کے پیڑ کے نیچے پڑے ایک چوکور پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور امجد کی قبر کو اشکبار نظروں سے دیکھنے لگی۔ اطراف گھنے درختوں کے پتوں سے رس کر ملگجی چاندنی سارے قبرستان پر اپنا تسلط جما چکی تھی۔ اندھیرے ادھر ادھر دبکے بیٹھے تھے۔ آج کا دن نظیرن کے لئے پہاڑ بن کر گزرا تھا۔ وہ یک لخت امجد کی قبر کو ٹکٹکی باندھے دیکھی جا رہی تھی۔ اس کے ذہن میں محشر خیال برپا تھا۔ گزرے حالات کی بیشمار یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ کڑی در کڑی اس کے تصور کے ورق پر ابھرنے لگا۔

آج اس نے ٹی وی پر دیکھا تھا کسی مندر پر دہشت گردوں کا حملہ ہوا تھا۔ دہشت گردوں نے کئی معصوم لوگوں کی جانیں لی تھیں۔ اور ایسے حالات پچھلے کئی ماہ سے گجرات کا مقدر بن گئے تھے۔ وہ خود بھی ظالم وقت اور سفاک حالات کی چکی میں پس کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی تھی۔ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ یہ لوگ جذبات اور احساسات سے عاری ہوتے ہیں۔ دوسروں کی دلآزاری اور انسانیت کا قتل دہشت گردوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ سیاست کے ہاتھوں یہ لوگ کھلونا ہوتے ہیں۔ یہ تاثرات لئے وہ دیر تک ٹی وی پر سب کچھ دیکھتی رہی۔ بالآخر دہشت گرد مارے گئے۔ ان کی شرمناک موت دیکھ کر وہ دہل اٹھی۔ اب ٹی وی

والے ان دہشت گردوں کی تصویریں دکھار ہے تھے۔ جو کمانڈوز کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس نے بڑے قریب سے دیکھا ایک لاش اسے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ اسکا شک یقین میں بدلنے لگا۔ یہ لاش اس کے اپنے امجد کی تھی۔ اسکی کھلی آنکھوں میں انتظار کے ساتھ ساتھ انتقام کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ امجد کا یہ انجام ہوگا اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ یہ وہ امجد تھا جو کبھی ممتا کی چھاؤں میں اسکی آغوش میں سر رکھ کر سو جایا کرتا تھا۔ لمبا چوڑا، گورا چٹا امجد جو ہمیشہ شرمیلا شرمیلا سا۔ نیچی نظریں کئے اس کے پاس آتا۔ اپنے دوستوں کی باتیں کرتا۔ فٹ بال میچ کی جیت کی خبریں سناتا کہتا خالہ جان دیکھنا آپکا یہ بیٹا ایک دن فٹبال کا مشہور کھلاڑی بن کر ساری دنیا پر چھا جائیگا۔ اور ٹی وی اسکرین پر امجد ہی امجد دکھائی دیگا۔ کچن میں کھڑی فوزیہ یہ سن کر کھل کھلا پڑتی۔ اس کے رخسار گلنار ہو جاتے۔ وہ مسکرا کے فوزیہ کی طرف دیکھتا اور چلا جاتا۔

امجد، نظیرن خالہ کے گھر کے سامنے واقع مسجد کی ایک چھوٹی سی کھولی میں رہتا تھا۔ وہ کہاں کا رہنے والا تھا اسکا تعلق کس گھرانے سے تھا نہ کبھی اس نے بتایا نہ نظیرن نے جاننے کی کوشش کی۔ اسے اس محلّہ میں رہتے ہوئے ابھی کل آٹھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اسکول جانا ابھی کھولی میں پڑھنا لکھنا شام کو فٹبال کھیلنا اور صبح شام نظیرن کے گھر کھانا کھانے آنا اسکا معمول تھا۔ وہ نظیرن کو بطور کھانے کا خرچ ۵۰۰ روپئے دیا کرتا تھا۔ یہ پیسہ اس کے پاس کہاں سے آتا یہ ایک معمہ ہی تھا۔ بہر کیف امجد انتہائی شریف النفس، ذہین اور اپنی دھن کا پکا نوجوان تھا۔ اسکا سراپا مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ اس میں ایک قسم کی کشش تھی۔ اس کی آنکھوں میں

سمندر کی سی گہرائی تھی ۔ جب وہ نظیرن کو ڈھیر سارے پان لاکر دیتا اور خالہ خالہ کہہ کر باتیں کرتا تب نظیرن ممتا کے جذبات سے مغلوب ہوکر اس کے سر پر دست شفقت رکھ کر خوب دعائیں دیتی ۔ اور امجد کے چہرے پر معصومیت کا رنگ آ جاتا ۔

فوزیہ اکثر امجد کو کھانا کھلاتی ۔ کسی کام میں لگی نظیرن دونوں کو دیکھتی جو ایک دوسرے میں کھوئے کھوئے نظر آتے امجد جب جانے لگتا تو فوزیہ اسے دروازہ تک چھوڑنے جاتی اور اس کے جانے کے بعد اداس اداس گھر میں آ جاتی ۔ نظیرن کی بوڑھی آنکھیں محبت کی اس کتاب کی ورق گردانی کرتی رہیں ۔

دن گزرنے لگے ۔ موسم بدلنے لگے ۔ بدلتے ہوئے موسموں کے ساتھ ساتھ امجد اور فوزیہ کی محبت بھی پروان چڑھنے لگی ۔ امجد کا بیشتر وقت فوزیہ کے گھر گزرنے لگا ۔ وہ اکثر اپنے مستقبل کے بارے میں اپنی نظیرن خالہ سے مشورہ کرتا ۔ وہ خود بھی امجد اور فوزیہ کی کہانی کو کوئی عنوان دینا چاہتی تھیں ۔ امجد کے دل میں فوزیہ کی محبت کے ساتھ ساتھ اپنی قوم وملت کی محبت کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ۔ وہ ملک میں رونما ہونے والے اکثر مذہبی فسادات کی خبریں پڑتا اور اپنے تاثرات نظیرن خالہ کے سامنے رکھ دیتا ۔ اس وقت اسکا چہرہ تمتما اٹھتا اسکی آنکھوں میں خون اتر آتا وہ اس قدر جذباتی تھا کہ کبھی کبھی نظیرن خوفزدہ ہو اٹھتی ۔ وہ اسے لاکھ سمجھاتی ۔ بیٹا آج کا یہ دور صرف اپنے بارے میں سوچنے کا ہے اپنے مستقبل کے بارے میں اپنے کیریئر کے بارے میں ۔ قوم کے بارے میں سوچنے کے لئے مولوی ملا ہیں ۔ مگر وہ اس کی باتوں کو ہوا میں اڑا دیتا ۔ اب امجد کی

حیثیت نظیرن کے گھر میں ایک فعد جیسی ہو چکی تھی۔

کچھ ہی دنوں کے بعد گجرات میں گودھرا سانحہ کے بعد قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی۔ ہندو مسلم فسادات کا ہیبت ناک سلسلہ چل پڑا۔ عصمت دریاں ہوئیں۔ لوگ زندہ جلا دئے گئے۔ پھیلتے پھیلتے یہ آگ نظیرن کے گھر تک آ گئی۔ محلّہ کی مسجد مسمار کر دی گئی۔ کئی مکانات نذر آتش ہو گئے۔ بچے بوڑھے لقمۂ اجل بن گئے۔ نوجوانوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ اس زہریلی آندھی سے امجد بھی اچھوتا نہ رہا۔ وہ سر پہ کفن باندھ کر میدان عمل میں اتر آیا تھا۔ اسکی معصوم آنکھوں میں انتقام اور نفرت کے گہرے سائے تھے۔ اسے محلّہ کے ایک الیکٹرک پول سے باندھ دیا گیا۔ محلے کی کئی نوجوان لڑکیوں کو میدان میں لا کر برہنہ باندھ دیا گیا تھا۔ اور ان کی عصمت دری کی گئی۔ ان لڑکیوں میں بدنصیب فوزیہ بھی تھی۔ امجد بے بسی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ بلوائیوں نے نہ صرف عصمت دری کی بلکہ ان معصوم لڑکیوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بھی بنایا۔ اپنی آنکھوں میں خون کے آنسو لئے امجد یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

طوفان آیا اور گزر گیا۔ فوزیہ کی تکفین کے بعد امجد کی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔ وہ اکثر بے جان مورت کی طرح خلاء میں گھورتا رہتا۔ اسکا وجود ویران ویران سا لگنے لگا تھا۔ اسکی اس کیفیت کو دیکھ کر نظیرن کا دل خون کے آنسو روتا۔ وہ اکثر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اسے دلاسہ دیتی۔ سمجھانے کی کوشش کرتی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ امجد نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ حتیٰ المقدور اسے تلاش کرتی رہی۔ مگر بے سود۔ اسکی زندگی کا آخری سہارا بھی کھو گیا تھا۔ وہ زار و قطار رو رو کر خدا سے دعائیں مانگتی۔ لوگوں سے

پوچھتی مگر بیکار۔ وہ اکثر امجد کی آنکھوں سے اٹھنے والے طوفان کا تصور کرتی اسکا کلیجہ دہل جاتا۔ مگر کسی طور خود کو سمجھالیتی۔ اور آج سات ماہ بعد محلّہ کی پان کی دوکان پر ٹی وی دیکھنے والوں کی بھیڑ کے درمیان اس نے دیکھا ایک مندر پر دہشت گردوں کا حملہ ہوا تھا۔ جنہوں نے بڑی سفا کی سے کئی لوگوں کا قتل کر دیا تھا۔ بالآخر دونوں دہشت گرد مارے گئے تھے۔ ان کی تصاویر دیکھ کر نظیرن چونک اٹھی تھی۔ ان میں سے ایک لاش امجد کی تھی۔ وہ امجد کو لاکھوں کی بھیڑ میں بھی بآسانی پہچان سکتی تھی۔ امجد کی لاش دیکھ کر اسکی بوڑھی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ لوگوں سے احساس حزن چھپائے اپنے میلے کچیلے ڈوپٹہ کو سنبھالتے ہوئے وہ بھیڑ سے باہر نکل آئی۔ سیاسی لیڈران دہشت گردوں کو پاکستانی کہہ رہے تھے۔ کوئی انھیں کشمیریوں کا نام دے رہا تھا۔ مگر سچائی نظیرن جانتی تھی۔

رات لمحہ لمحہ سسک رہی تھی۔ نظیرن کی سسکیاں بھی خاموشی کی پرتوں سے رہ رہ کر ابھر رہی تھیں۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور بوجھل قدموں سے اندھیرے میں گم ہوگئی۔ اطراف خاموشی اب بھی رہ رہ کر چیخ رہی تھی ماحول ماتم زدہ ہو چکا تھا۔ سرد ہوائیں مزید تیز ہوگئیں تھیں۔

نوٹ:

(اس افسانے میں متعمل سارے کردار نام فرضی ہیں حقیقت سے ان کی مطابقت محض ایک اتفاق ہے۔)

☆☆☆

خاجو پھوپّو

آج ٹیلی فون کی گھنٹی میں کس بلا کا درد تھا۔ ابھی ابھی خاجو پھوپو کے انتقال کی خبر آئی تھی۔ تنہائی میں بیٹھا میں خاجو پھوپو کے بارے میں سوچنے لگا تو ان کی زندگی کی کربناک کتاب کا ایک ایک ورق جو بوسیدہ ہو چلا تھا۔ میرے تصور کی آنکھوں کے سامنے جنبش کرنے لگا۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لیکر خاجو پھوپو سے آخری ملاقات کا وہ یادگار لمحہ سب کچھ میرے ذہن کے پردہ پر ایک فلم کی مانند رقص کرنے لگا۔

خاجو پھوپو میرے والد مرحوم کے کسی دور کے رشتہ سے خالہ زاد بہن لگتی تھیں۔ انکا پورا نام خواجہ بی تھا مگر محلہ بھر میں وہ خاجو کے نام سے مشہور تھیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انھیں اکیلا ہی پایا۔ حالانکہ ان کے تین بیٹے تھے۔ مگر سب ان سے الگ دیگر محلوں میں رہا کرتے تھے۔ ان کے شوہر اور والدہ کو گزرے ہوئے کئی برس بیت گئے تھے۔ ان کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی۔ جو قریب ہی کسی دیہات میں رہتی تھی۔ خاجو پھوپو ہمارے مکان کے عقب میں واقع گلی کے موڑ پر ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتی تھیں۔ مٹی کی چھوٹی چھوٹی دیواروں سے گھرا اور پرانے کویلوں کی چھت سے ڈھکا ایک کمرہ، سامنے چھوٹا سا آنگن جسکے ایک سرے پر گھانس پھونس سے بنا ایک غسل خانہ، آنگن میں گل عبّاس کے دو تین پودے، ان کے آس پاس مٹی کے دو گھڑے ایک چھوٹا سا مٹکا اور لوہے کی پرانی بالٹی، کمرے میں ایک پرانی چارپائی اس پر ایک بوسیدہ بستر، تکیہ

کے نیچے ایک پرانی تسبیح، جگہ جگہ پیوند لگی ایک چادر، سامنے ادھ جلی لکڑیوں سے بھرا چولہا۔ اطراف میں دو چار ایلومنیم کے پرانے برتن، مٹی کی ہانڈی کنارے ٹوٹے چائے کے کپ پلیٹ، یہ تھی خاجو پھوپو کی کل کائینات۔ جس کے سہارے وہ جینے کی رسم کسی طرح پوری کر رہی تھیں۔

ان کا سراپا بھی بڑا متاثر کن تھا۔ عمر اسقت ۵۵۔۶۰ کے قریب رہی ہوگی۔ مگر ان میں ایک قسم کی خود اعتمادی جھلکتی تھی۔ پستہ قد، گول چہرہ جا بجا چیچک کے داغ، جو متانت اور سنجیدگی سے آراستہ دکھائی دیتے تھے۔ ہونٹوں پر اکثر ہلکی سی مسکراہٹ رینگتی نظر آتی تھی۔ بدن پر کالے رنگ کی ازار اور سفید رنگ کی کرتی جس پر چھوٹے چھوٹے بوٹے ہوا کرتے تھے۔ اور سفید رنگ کا لمبا چوڑا دوپٹہ ہمیشہ رہا کرتا تھا۔ ساری زندگی ان کی اسی سادہ ملبوس میں کٹ گئی۔ پیروں میں ربر کی چپلیں جو برسوں پرانی دکھائی دیتی تھیں۔ خاجو پھوپو صبر و قناعت کی مورت تھیں۔ ان کا استقلال مثالی تھا۔ وہ روزانہ صبح پانچ بجے سے اپنی چند ہم عمر بوڑھی عورتوں کے ساتھ شہر کی ایک جیننگ فیکٹری میں مزدوری کے لئے جاتی تھیں۔ شام کو تھک ہار کر جب گھر لوٹتیں تو میں اکثر انھیں سڑک سے ملحق میدان سے گزرتا ہوا دیکھتا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں کھیل کو دسب کچھ بھول جاتا۔ اس وقت ان کے سر پر سوکھی لکڑیوں اور گھاس پھونس کا ایک چھوٹا گٹھا ہوتا اور ہاتھ میں ایک میلی تھیلی۔ جس میں شاید کھانے کا ڈبہ رکھا جاتا تھا۔ اپنی روایتی پوشاک زیب تن کئے وہ تھکے تھکے قدموں سے سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے بازو کی گلی میں روپوش ہو جایا کرتی تھیں۔ جب شام کا دھندلکا کچھ گہرا ہونے لگتا میں کھیل کے میدان سے گھر کی سمت لوٹتا اس وقت

ایک بار پھر محلّہ کے کنویں پر خاجو پھوپو کے درشن ہو جاتے ۔ وہی نقاہت زدہ بدن، تھکے تھکے ہاتھوں اور پھولی ہوئی سانسوں کے سہارے کنوئیں سے مٹی کی ٹھلیا میں پانی نکالتے ہوئے ۔ جی چاہتا کہ میں ان کی مدد کروں مگر..... بس انھیں یوں ہی دیکھتا رہتا ۔ سہارا دینے کی کوشش کرتا تو کہتیں ''بیٹا... بڑا ہو جا پھر میری مدد کرنا۔''

وہ معمول کے مطابق روزانہ راتمیں ایک بوسیدہ کپڑے میں اپنا کھانا باندھ کر ہمارے گھر آجاتیں اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھالیتیں ۔ اس وقت ان کے چہرہ سے دن بھر کی تھکان نجانے کہاں غائب ہو جاتی ۔ کھانے کے بعد وہ ایک پلاسٹک کی پرانی ٹوکری سے پان نکال کر خود بھی کھاتیں اور ساتھ میں امی کو بھی گلوری بنا کر دیتیں ۔ اور سپاری کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہمارے حصہ میں بھی آتے ۔ پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ۔ کبھی کبھی چاندنی راتوں میں دیر رات تک قصے کہانیوں کا دور دن کے واقعات پر تبصرے، شادی بیاہ موت وحیات کی باتیں چلتی ۔ میں تو درمیان میں ہی نیند کی آغوش میں پہنچ کر خراٹے لینے لگتا ۔ پھر خاجو پھوپو کا دوسرے دن کھیل کے میدان میں ہی دیدار ہو پاتا ۔

خاجو پھوپو سارے محلّہ میں مشہور تھیں ۔ وہ بڑی حلیم اور ملنسار خاتون تھیں ۔ محلّہ میں کوئی تقریب ہو، موت میت ہو عقیقہ یا ختنہ کی رسم ۔ ہر کام میں وہ حاضر، لوگ اکثر کام ان کے مشوروں سے کرتے ۔ مریضوں کی عیادت کے لئے وہ ہمہ وقت تیار رہتیں ۔ میں نے اپنے بچپن میں علالت کے کئی ایام ان کے آغوش میں سو کر گزارے تھے ۔ ان کی شفقت کی بے شمار یادیں ۔ آج بھی میری زندگی کا بیش بہا سرمایہ ہیں ۔

جب تک میں صاحب فراش رہتا وہ بھی فکر مند اور بے چین رہتیں۔ وقت لمحہ لمحہ، دن ہفتہ اور ماہ وسال بن کر گزرنے لگا۔ بڑھتی عمر اور گھٹتی جسمانی طاقت خاجو پھوپو کے لئے نئی نئی مصیبتیں لیکر آتے۔ جیننگ فیکٹری بند ہو جانے کی صورت میں وہ اکثر مالی پریشانی کا شکار رہتیں۔ طبیعت میں خودّاری اتنی تھی کہ فاقہ کرلیتیں مگر کسی سے کچھ نہ مانگتیں۔ محلّہ کے کچھ مکانوں میں صاف صفائی، لپائی پتائی کا کام یا پھر کھیتوں، باغ یا باغیچوں میں مزدوری کرلیتیں۔ کسی طرح پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی تھا۔ ان کا صبر تحمل اور استقلال دیکھتے بنتا تھا۔ کبھی صرف شکایت انکی زبان پر نہیں آیا۔ انکی خموشی میں نجانے کیا کیا دفن تھا۔ یہ راز آخر تک راز ہی رہا۔

کبھی کبھی وہ بیمار پڑ جاتیں یا مجھ سے ملاقات کئے دو چار دن گزر جاتے اس وقت مجھے بڑی بے چینی ہوتی۔ میں گھر سے کچھ کھانا اور پھل لیکر انکی کٹا پر پہنچ جاتا۔ انھیں سہارا دیکر بستر سے اٹھاتا، منھ دھلا کر کھانا کھلاتا۔ ان کی ہدایت کے مطابق ان کی پرانی شیشیوں سے جڑی بوٹی کی دوائیاں نکال کر انھیں کھلاتا۔ ان کے منھ سے دعاؤں کا سیلاب امنڈ پڑتا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی۔ اور انکی بوڑھی آنکھوں میں شفقت کی نمی صاف دکھائی دیتی تھی۔

حالات کا دھارا بہتا رہا۔ موسم بدلتے رہے۔ بدلتے حالات نے مجھے ملازمت کے سلسلہ میں وطن سے پردیس میں جاب ملا۔ زندگی کی نئی مصروفیات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ سوچنے کا انداز اور معمولات تک بدل گئے۔

کچھ ماہ بعد ملازمت کی مصروفیات سے وطن لوٹا تو خاجو پھوپو کی

یاد آئی۔ فوراً ان کی کٹیا کا روخ کیا۔ وہی چار پائی، میلا کچیلا بستر اس پر چند ہڈیوں پر مشتمل خاجو پھوپو کا نحیف سراپا۔ مجھے دیکھا تو چہرہ پر چمک آ گئی۔ اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے سہارا دیکر اٹھایا۔ مجھے سینہ سے لگا لیا۔ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ نجانے کیوں ان کی آنکھیں چھلک آئیں۔ آواز رندھ گئی۔ پھر بھی میری خیریت پوچھنے لگیں۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی چیزیں، کپڑے، چپلیں ان کے حوالے کر کے میں دوسرے دن ڈیوٹی پر لوٹ آیا۔ واپسی پر میرے ذہن میں ایک عجیب سا بکھرا بکھرا سا تاثر تھا۔ ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر خاجو پھوپو کا بے بس چہرہ میرے تصور میں ابھر رہا تھا۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔

پچھلی مرتبہ عید کے موقعہ پر خاجو پھوپو سے ملاقات ہوئی۔ یہ ان سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس بار میں ان کے لئے چشمہ لیکر گیا تھا۔ چشمہ پہن کر بہت خوش ہوئیں۔ بہت دعائیں دیں۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے یہ احساس ہو چکا تھا کہ اب آخری پڑاؤ قریب ہے۔ خاجو پھوپو کی زندگی کے دن بس گنے چنے رہ گئے ہیں۔ سفر اب قریب الختم ہے۔ ملازمت پر لوٹنے سے پیشتر جب ان سے ملنے پہنچا تو وہ ایک پتلی سی چادر اوڑھے صبح کی سردی کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ کانپتے ہاتھوں سے مجھے الوداع کہا۔ بوجھل قدموں سے میں واپس ہوا۔ لوٹتے وقت ان کی آنکھوں میں بے بسی اور یاس وحسرت کی پرچھائیں نمایاں تھیں۔

اور.... اور... آج ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اور یہ دردناک خبر ملی کہ کہانی ختم ہوگئی۔ خاجو پھوپو کی زندگی کی کہانی۔ خاجو پھوپو کے دکھوں کا اختتام ہوگیا۔ درد کا وہ گیت جو عرصہ سے ساز ہستی پر گایا جا رہا تھا وہ کہیں

روپوش ہوگیا ہے۔ خاجو پھوپو کے ساتھ ایثار، قربانی، محبت بھائی چارہ، صبرواستقلال، خوداری اور بے لوث رشتوں کا ایک دور ختم ہوگیا۔

میری آنکھوں سے آنسو نکل کر فرش پر بکھر گئے میں سوچ رہا تھا خاجو پھوپو کی زندگی ایک غم زدہ احساس ایک درد بھرا تاثر اور وقت کا ایک المیہ ضرور تھی مگر وہ گزرتے لمحوں کے کینواس پر کوئی نقش بنانے میں ناکام ثابت ہوئی۔

☆☆☆

سکندر عرفان